Scanned by CamScanner

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

**میر ظہیر عباس روستمانی**

03072128068

انجمن آرزو

(سفرنامہ)

ڈاکٹر حامدی کاشمیری



ناشر

ادارۂ ادب، مسعود منزل، شالیمار، سرینگر

کشمیر

مصنف حامدی کاشمیری
بار اول ۱۹۸۹ء
تعداد ایک ہزار
طابع جے، کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
قیمت پچھتر روپے



ملنے کا پتہ:

۱۔ ادارۂ ادب، شالیمار، سری نگر
۲۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی
۳۔ علی محمد اینڈ سنز، سری نگر کشمیر

ہندوپاک کے فنکاروں

کے نام

حامدی کاشمیری

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

غالبؔ

# احوال واقعی

زندگی مسلسل حرکت ہے، اور سفر، حرکت کا دوسرا نام، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو زندگی کو بھوگتا ہے، مدام سفر کے عالم میں رہتا ہے، اگر وہ جسمانی طور پر عالم سفر میں نہ ہو، گھر میں بیٹھ کر ذہنی طور پر ہی گھر سے باہر قدم رکھے، تو اسکی حالت سفر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، سفر انسانی فطرت میں ہے، انسان کے عہد بہ عہد ارتقار کی دلیل، یوں بھی انسان کی پیدائش سے ہی اس کے سفر کی داستان شروع ہوتی ہے اور پھر حضرت آدم نے جب ثمر ممنوعہ چکھنے پر جنت سے نکل کر روئے زمین پر قدم رکھا۔ تو اس کے سفر کا آغاز ہوا، اور وہ مسلسل سفر میں ہے ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اردو میں سفر ناموں کی روایت زیادہ قدیم نہیں، موجودہ صدی میں کئی ادیبوں نے سفر نامے لکھے ہیں۔ سفر نامہ تجربات کی گونا گونی، معلومات کی فراہمی، واقعات و اشخاص اور مناظر کے بارے میں شخصی تاثرات کی بار آفرینی کی بنا پر ایک دلچسپ صنف کے طور پر فروغ پا رہا ہے، یہ ضرور ہے کہ سفر نامے میں ادیب کو حقیقی افراد واقعات، مناظر اور معاملات کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اور شروع سے آخر تک بیانیہ کا دامن تھام لینا پڑتا ہے، لیکن یہ خارجی واقعات و شخصیات کا محض حقیقت پسندانہ

بیان نہیں، بلکہ یہ مسافر کی شخصیت، زاویۂ نگاہ، رویے، مشاہدہ اور داخلی ردِعمل کی مصوری کے وافر امکانات رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ خارجی حقائق بھی بعض صورتوں میں تقلیب پذیر ہوتے ہیں، اس طرح سے سفرنامہ محض واقعات وحالات کا غیر شخصی اور خشک بیان ہو کر نہیں رہ جاتا، بلکہ دلکش اظہار بن جاتا ہے۔

زیرِ نظر سفرنامہ کے بارے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ میں نے پاکستان کا یہ سفر (جنوری ۱۹۸۹ء) ملک کے نمایندہ ادیبوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے کیا ہے، کسی وفد کے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ طے شدہ پروگرام کے تحت ہی نقل وحرکت روا رکھی جائے۔ چونکہ ہمارا دورہ ادبی نوعیت کا تھا، اور باہمی خیرسگالی کے جذبے کو تقویت دینے کے لئے تھا۔ اس لئے ہماری ملاقاتیں زیادہ تر ادیبوں اور فنکاروں سے ہی رہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا دورہ چونکہ صرف دو ہفتوں کا تھا، اس لئے ادیبوں سے مختصر اور لمحاتی ملاقاتیں ہی ممکن تھیں، تاریخی مقامات، دانش گاہوں، جلسہ گاہوں اور اکاڈمیوں کا مشاہدہ بھی ایک طائرانہ نظر سے ہی ممکن تھا، یعنی اس سیاحت کے دوران ہماری مصروفیات کا وہ عالم رہا کہ ایک ایک لمحے کا حساب دینا پڑا۔ بھاگم بھاگ اور دواروی کے اس عالم میں ظاہر ہے، اشیاء، اشخاص اور اداروں کے بارے میں کسی عالمانہ اور تفصیلی ردِعمل کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ پھر بھی مصروفیت کے اس ہنگامہ خیز عالم میں، جو کچھ بھی اپنے دامنِ دل میں سمیٹ سکا ہوں، اسے پیش کر رہا ہوں، ظاہر ہے اس سفرنامہ میں کفایت اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، اختصار یوں بھی ادب کا لازمہ ہے، میں نے پیشِ نظر سفرنامے میں اسے حتی المکان روا رکھا ہے، میں ان سفرناموں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا، جو کتابی معلومات سے گرانبار ہوں، سفرنامہ اگر کتابی معلومات کے دفاتر کھولتا ہے، تو وہ علمی مقالہ بن

جاتا ہے، سفرنامہ نہیں رہتا، میری دانست میں سفرنامہ اختصار پسند، تاثراتی اور شخصی ہو تو مناسب ہے۔

میں اپنی رفیقۂ حیات مصرہ مریم، جو پاکستان کی سیاحت میں میری ہمسفر رہیں، کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں، وہ سفر کے نوٹس لینے میں قدم قدم پر میرا ہاتھ بٹاتی رہیں، مجھے اعتراف ہے کہ ان کی رفاقت اور عملی معاونت میسر نہ ہوتی، تو یہ سفرنامہ ہرگز مکمل نہ ہو سکتا۔

میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم، ترقی اردو بیورو اور پاکستان اکاڈمی آف لیٹرز کے ارباب اختیار کا شکرگزار ہوں، جنہوں نے ہمارے دورے کو معنی خیز، آرام دہ اور دلچسپ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

میں خاص طور پر اپنے عزیز دوست ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب جو وفد کے ایک ممتاز رکن تھے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے ہمارے لئے اس سفر کو ممکن بنانے میں ذاتی دلچسپی لی۔

حامدی کاشمیری

مسعود منزل
شالیمار، سرینگر کشمیر۔

## چوں چشم می پرم بہوائے نظارہ ات
## موجِ نگاہ شہپرِ پرواز شُد مرا

ایئرانڈیا کا بوئینگ طیارہ بادلوں کے منجمد اور بے کنار سمندر کے اُوپر سے پرواز کر رہا تھا، اور اب اس کی رفتار کی سمت متعین ہو چکی تھی۔ روانگی سے پیشتر میں نے کئی بار آسمان کی جانب دیکھا تھا اور بادلوں کے ریلوں کو دیکھ کر ڈر سا محسوس کرتا رہا کہ کہیں موسم کی خرابی جہاز کی پرواز میں حائل نہ ہو۔ بادلوں سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جس خطۂ زمیں سے تعلق رکھتا ہوں وہاں بادل بارہ مہینوں میں سے تقریباً نو مہینوں تک بلا شرکت غیرے حکومت کرتے ہیں اور وہ من مانی کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ، کبھی ہفتوں تک وادیوں اور پہاڑوں پر چھائے رہتے ہیں اور سورج کی ایک جھلک کے لئے ترساتے ہیں، کبھی برف بن کر دفن کرنے پر تُل جاتے ہیں اور کبھی پہاڑوں سے اتر کر سڑکوں اور گلی کوچوں کو تاریکیوں میں ڈبو دیتے ہیں اور اس سال تو حد ہی کر دی درجۂ حرارت کو نقطۂ انجماد سے گیارہ درجے نیچے گرا کر پوری وادی کو یخ بستہ کر دیا۔ یہاں تک کی جھیلیں بھی منجمد ہو کر شیشہ بن گئیں۔ بادلوں کی یہ جناتی شکل میری

آنکھوں میں تھی۔ اس کے برعکس میدانوں کے بادل تو بہت ہی ملایم اور شفاف نکلے، جیسے بادل نہ ہوں دھنکی ہوئی روئی ہو۔ اصل میں بادل خوب جہاں دیدہ ہوتے ہیں۔ وہ ملکوں ملکوں پھرتے ہیں۔ بحر و بر سے گزرتے ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ کن لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے ہمیں پہاڑوں کے باسی سمجھ کر ہماری سخت جانی کا امتحان کرتے ہیں لیکن میدانوں کے باسی بھی ان کے ظلم کے شاکی رہتے ہیں۔ یہ ظلم وہ ان پر گرمیوں میں اپنی مسلسل مفارقت سے ڈھاتے ہیں۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے، حبس ہے، زمین کا سینہ پیاس کی شدت سے پھٹ رہا ہے لیکن بادلوں کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اصل میں بادل قلوپطرائی مزاج رکھتے ہیں اور ان کا وصل ہو کہ فصل۔ دونوں بلائے جاں ہیں۔

بعض مسافروں نے اپنی نشستوں کے بیلٹ کھول دیئے تھے۔ بعض لوگ طیارے کی چھوٹی سی راہداری سے احتیاط سے آجا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ڈھلتی عمر کی سانولی رنگت کی قبول صورت ایئر ہوسٹس مصنوعی مسکراہٹ کا بے مقصد استعمال کر کے سامنے سے گزرتی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو میری دائیں جانب بیٹھے تھے اس سے کسی چیز کی فرمائش کی تھی۔ لیکن کئی منٹ گزرنے کے بعد بھی وہ کیبن سے واپس نہیں لوٹی تھی۔ نارنگ صاحب زچ ہو کر اپنی نشست سے اٹھے اور انہوں نے سامنے کی دیوار پر لٹکا ہوا شکایتی کارڈ اٹھایا اور ایئر ہوسٹس کی غفلت شعاری کے خلاف شکایت رقم کرنے لگے۔

"نارنگ صاحب یہ بھی لکھ دیجئے کہ جہاز بھی نہایت خستہ حالت میں ہے"۔۔۔۔ میں نے دیکھا تھا کہ نشستوں کے پیچھے جو کپڑا لگا ہوا ہے پرانا اور میلا ہو چکا ہے۔ بعض جگہوں پر پھٹا ہوا بھی، منقش دیواروں سے خستگی ٹپک رہی ہے۔ ادھر سامنے کی نشست پر جگن ناتھ آزاد صاحب بھی اپنی شکایت قلمبند کر رہے تھے۔ انہوں نے کئی بار پرواز کے شروع ہونے سے قبل کانوں میں ٹھونسنے کیلئے روئی مانگی تھی۔ جو ابھی تک ان کو پیش نہیں کی گئی تھی،

"وہ روئی آپ کو کیا دیں گے؟ وہ تو انہوں نے اپنے کانوں میں ٹھونس دی ہے"۔ میں نے کہا۔

میری بائیں طرف طیارے کی کھڑکی کے ساتھ مریم، درونِ خانہ کے ہنگاموں سے بے نیاز، بادلوں کے بے حرکت سمندر کو دیکھنے میں محو تھیں میں طمانیت اور مسرت کے احساس سے سرشار سوچ رہا تھا کہ ہمارا دورۂ پاکستان حدودِ گماں کو عبور کرکے یقین کی روشن سرحدوں کو چھو رہا ہے۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے جب ہم نئی دہلی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر سیکورٹی چیکنگ کروا کے سیکورٹی لاونج میں بیٹھے تھے اور طیارے کی روانگی کے لمحے کا انتظار کر رہے تھے تو اس وقت تک بیورو کی ڈائریکٹر فہمیدہ بیگم، ان کے عملے کے افراد اور ایجوکیشن منسٹری کی نمائندگی کرنے والے آفیسر غائب تھے۔ وفد کے اراکین میں مسعود حسین خان، جگن ناتھ آزاد، خلیق انجم، رفیعہ سلطانہ اور مریم اور میں پہلے ہی لاونج میں آ چکے تھے اور سبھوں کو اس بات کی تشویش تھی کہ بیورو اور ایجوکیشن کے آفیسروں کی آمد مشکوک ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ وہ وقت پر اپنا ویزا نہیں بنوا سکے تھے۔ ان کے آنے میں تاخیر ہو رہی تھی اور یہ تاخیر ہمارے لیے اس لئے بھی باعثِ تشویش تھی کہ یہ پورے وفد کی روانگی میں حارج ہو سکتی تھی۔ اتنے میں سامنے سے محترمہ صالحہ عابد حسین آ گئیں، وہ ذاتی دورے پر کراچی جا رہی تھیں۔ ان سے سلام دعا ہوئی۔ وہ خواتین سے ہمکلام ہوئیں، مسعود حسین خان میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے، وہ رہ رہ کر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

"معلوم نہیں نارنگ صاحب کہاں رہ گئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں ناریل تھما دیئے تھے اور ناریل چیکنگ آفیسر نے روک دیئے ہیں وہ انہیں توڑ کر اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

نارنگ صاحب، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ بیورو کے ارکان کے منتظر تھے اور ائرپورٹ پر ان کے دیر سے پہنچنے پر مختلف FORMALITIES کی تکمیل میں ان کی اعانت کر رہے تھے۔ مسعود صاحب پھر کہہ رہے تھے۔

"نارنگ صاحب کے ناریل روک لئے گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا"۔

"آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ نارنگ صاحب آئیں گے تو ناریل کو ثابوت، یا تڑوا کر چھڑوا لیں گے۔"

"جی ہاں' اس بحر کی تہہ سے کیا اُچھلے' کِسے معلوم" میں ہنس پڑا مگر مسعود صاحب سنجیدہ تھے۔

مریم رفیعہ سلطانہ سے ہمکلام تھیں رفیعہ سلطانہ کہہ رہی تھیں' ——

"میں نے آپ کے میاں کی کئی چیزیں پڑھ لیں۔ ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں ان کی تنقید بہت فکر انگیز ہے۔"

میں بے چینی محسوس کرنے لگا' نہ جانے کیوں مجھے اپنی تعریف سُن کر بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آزاد صاحب سے کہا —"آپ پاکستان بار بار جا چکے ہیں اس لئے آپ کو شاید اتنی —— EXCITEMENT نہیں ہو گی جتنی کہ ہم محسوس کر رہے ہیں"۔

"جی —؟ جی ہاں — میری خوشی ایک ایسے شخص کی سی ہے' جو اپنے وطن جا رہا ہو"۔ اُن کے لہجے میں سکون تھا لیکن آنکھوں سے جذباتیت چھلک رہی تھی۔ آزاد صاحب پچھلے سفر پاکستان کی روداد سنانے لگے ؎

تیرے خیال سے روُح اہتزاز کرتی ہے۔

اتنے میں سامنے سے وفد کے دیگر اراکین کے علاوہ قائدِ وفد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پوری وجاہت کے ساتھ نمودار ہوئے دیگر اراکین میں فہمیدہ بیگم' ابوالفیض سحر اور چتر ویدی شامل تھے۔ سب کے آخر میں نارنگ صاحب بہ نفسِ نفیس تشریف لائے ——

"بڑی مشکل سے ویزا ملے ہیں اور ہم بھاگتے ہوئے یہاں آپہنچے ہیں" فہمیدہ بیگم پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہنے لگیں۔ میں آگے بڑھ کر بیدی صاحب سے بغلگیر ہوا۔ بیدی صاحب اپنے مخصوص لباس یعنی کرتہ پائجامہ اور واسکٹ میں ملبوس تھے اور خاصے خوش و خرم اور چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں نور اور چہرے اور داڑھی پر جلال تھا میں ان کی توانائی' بشاشت اور صحت دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے برسوں پہلے ان کو سرینگر کے

ٹیگور ہال میں منعقدہ ایک کُل ہند مشاعرے کی نظامت کرتے دیکھا تھا۔ میرا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے غیر متوقع طور پر میرے حق میں کئی توصیفی کلمات استعمال کئے تھے۔ میں اس روز ان کے حُسنِ نظامت اور حاضر جوابی کا قایل ہو چکا تھا۔ ان کی لطیفہ گوئی اور فقرہ بازی سے محفل زعفران زار ہو گئی تھی۔ پاکستان روانگی سے قبل ایک روز مجھے بیورو کے دفتر میں معلوم ہوا کہ بیدی صاحب وفد کے راہنما ہیں تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ بیدی صاحب جیسے مُعمّر شخص کو یہ زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی میرا خیال تھا کہ وقت کی رفتار نے بیدی صاحب کو ضعیفی اور تساہل سے ہمکنار کیا ہوگا ہم خود وقت کی زد میں آ چکے ہیں جوانی پیچھے رہ گئی ہے اور اب تساہل پسندی کی وجہ سے سفر کی صعوبتوں سے گریز کر کے زیادہ سے زیادہ خانہ نشینی کی رغبت ہوتی ہے۔ بالوں کی بڑھتی ہوئی سپیدی اور جسم کی کم طاقتی سے زوال عمر کا احساس ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ دورۂ پاکستان کے خیال سے زوال عمر کے خیالات، جنہیں بعض لوگ منفی خیالات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذہن سے محو ہو چکے تھے اور دل میں جوانوں کی سی قوت، مستعدی اور جوش پیدا ہو رہا تھا۔

جذبۂ بے اختیاری شوق دیکھا چاہیئے

لیکن بیدی صاحب تو عمر میں مجھ سے آگے ہیں۔ دورے کے دوران میں ان کو پا در رکاب رہنا پڑے گا لیکن میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ شکل و صورت اور جسم کی ہیئت کے لحاظ سے اتنے ہی چُست، توانا، بشاش اور مستعد ہیں جتنا کہ برسوں پہلے تھے میں نے بیدی صاحب سے مریم کا تعارُف کروایا۔

"جیتی رہو بیٹی"—— انہوں نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے معاً محسوس کیا کہ اِن کے دل میں محبت اور شفقت کے سوتے پوری آب و تاب کے ساتھ رواں ہیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ رفتارِ وقت نے کیوں اُن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ انسان کا دل سرسبز و شاداب ہو تو جسم بھی سدا بہار رہتا ہے۔

معاً مجھے یاد آیا۔ سیکورٹی آفیسر کہہ رہا تھا۔

"کنٹنگ میں ناریل ہی میں بم رکھا گیا تھا"۔

"کمال ہے!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مسعود صاحب کو بڑی پریشانی تھی کہ ناریل چیکنگ کے لئے روک گئے ہیں" میں نے نارنگ صاحب سے کہا۔

"جی ہاں ناریل توڑے گئے۔ ناریل توجا سکتے ہیں لیکن پانی نہیں جا سکتا"۔

خاموشی طول پکڑ گئی۔

"یہ دیکھو، ریت ہی ریت ——— ریت کے ٹیلے"۔ مریم نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا دور دور تک بے آب وگیاہ ریگستان ہیں۔ جن میں آدم نہ آدم زاد۔ ابھی زمین کے کتنے وسیع رقبے ایسے ہیں جن پر انسانوں کے قدم نہیں پڑے ہیں اور ان کی دوشیزگی اور تقدس برقرار ہے۔ ریگستانوں کا جو سفر پہلے مہینوں میں طے ہوتا تھا اب منٹوں میں طے ہوتا ہے۔ واقعی انسان نے اپنی دماغی قوتوں سے کام لے کر معجزے کر دکھائے ہیں۔ وہ کس خوبی اور ہنرمندی سے فطرت کی اندھی قوتوں پر غالب آگیا ہے۔ دل ودماغ کی قوتوں کے صحیح استعمال سے وہ فطرت کے کتنے نادیدہ امکانات کو اپنے مصرف میں لا رہا ہے۔ ریگزاروں کو گلستانوں میں تبدیل کرتا ہے پانی سے بجلی پیدا کرتا ہے سمندروں کو چیر کر گزرتا ہے اور ہوائی جہاز سے فاصلوں کو بے معنی بناتا ہے لیکن سائنس کے یہ کارنامے انیسویں صدی میں غالب کو حیران کر چکے تھے اور یہ بیسویں صدی ہے، انسان اب خلا کو چیر کر ستاروں اور سیاروں کی جانب محو پرواز ہے۔

"یہ سندھ کا ریگستان ہے۔ اسے پار کرنے کے بعد ہی پاکستان آئے گا" نارنگ صاحب نے کہا۔

اور چند ساعتوں کے بعد ہی ریگستانی علاقے میں کہیں کہیں کوئی راستہ کوئی آراستہ قطعۂ زمین، کوئی مکان نظر آنے لگا اور پھر رہائشی مکانوں کے ہجوم ——— ہم سچ مچ کراچی پہنچ رہے

تھے۔

کراچی اور پاکستان کے دیگر شہروں کو دیکھنے اور وہاں کے لکھنے والوں سے ملنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہورہی تھی۔ کبھی کبھی اپنے ملک میں کسی ادیب سے ملاقات ہوتی جو پاکستان سفر کرکے لوٹا ہوتا اور وہ وہاں کی ادبی فضا، مذاکروں، ادبی صحافت اردو اداروں اور کتابوں کی اشاعت اور پھر کتابوں کی رسم اجرا کی تقاریب کی تفصیلات سنا کر وہاں جانے کی آتش شوق کو ہوا دیتا۔ لیکن وہاں جانے کی صورت کیا تھی؛

تمثال جلوہ عرض کرا ے حسن کب تلک

آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی

"میرا خیال ہے کہ پاکستان کے دورے کے دوران ہم حکومتِ پاکستان کے مہمان ہوں گے اور صدر پاکستان ہمارے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کریں گے" آزاد صاحب نے سیکیورٹی لاؤنج میں یہ بات مجھ سے کہی تھی۔ یقین آمیز لہجے میں؛ لیکن فہمیدہ بیگم نے اس ضمن میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ ۵ جنوری سے ۷ جنوری یعنی روانگی کے دن سے طیارے میں بیٹھنے سے قبل تک وہ جس غیر یقینیت اور تذبذب کا اظہار کررہی تھیں اس سے ان کی لاعلمیت کی توثیق ہورہی تھی۔ ان کی غیر یقینیت جو واقعتاً موجود تھی کی بنا پر وفد کے بعض ارکین مثلاً مسعود حسین خان، جگن ناتھ آزاد اور مجھے ویزا بنوانے اور زرِ مبادلہ کے حصول میں جو دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور جو پاپڑ بیلنے پڑے۔ ان کو یاد کرکے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی ہے

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال

ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

بیورد سے اشوکا ہوٹل تک ہمیں رات گئے تک سرد ہوا کے تھپیڑوں کا سامنا کرتے ہوئے جتنے چکر کاٹنا پڑے اور قدم قدم پر جن صبر آزما مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن سے دل برداشتہ ہوکر ایک سے زاید مواقع پر مسعود حسین خان اور آزاد صاحب ہمت ہار بیٹھے۔ اور

انہوں نے بیچارگی اور برہمی کے عالم میں سفرِ پاکستان سے معذوری کا اظہار کیا لیکن ہم دونوں نے ان کی ہمت بندھائی ؎

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پروگرام میں خدانخواستہ کوئی رخنہ پڑے یا کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جملہ صعوبتوں کو استقلال کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

چوں عشقِ حرم باشد سہل است بیابان ہا

ائیر ہوسٹس اعلان کر رہی تھی۔

"ابھی چند لمحوں میں ہمارا جہاز کراچی کے ائیر پورٹ پر اتر رہا ہے۔"

میں نے باہر نظر دوڑائی۔ سہ پہر کی چمکتی دھوپ میں حدِ نظر تک قطار اندر قطار رہائشی مکانوں اور دیگر تعمیرات سے آباد کراچی کا شہر ایک بے لباس خودنما اور خود نگر اجنبی دیار کا تاثر پیدا کر رہا تھا۔

میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

بعض علاقوں میں جا کر وہاں کے لوگوں کی شکل و صورت، لباس، رہن سہن اور زبان، نیز وہاں کے مکانات، سڑکوں اور گلی کوچوں کو مشتاق اور متجسس نظروں سے دیکھنا مجھے ایک انوکھی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ بچپن میں، جب میں اپنے گھر سے نکال جاتا تو وہاں کی کھلی فضائیں، سبزہ پوش میدان، پیڑ پتے اور ندیاں دیکھ کر خوش ہوتا، مجھے محسوس ہوتا کہ میں بھوری کدال کی تنگ و تاریک فضا سے نکل کر ایک شاداب اور روشن دنیا میں وارد ہوا ہوں۔ ایک روز جب میرے والد صاحب مجھے پہلی بار شہر سے دور اننت ناگ لے گئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سرسبز کھیت، سفیدے کے اونچے اونچے درخت، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مرد و زن، ان کے گیت، وہاں کے بازار، لوگوں کی گھریلو زندگی، صحنوں سے بہتے پانی کے جھرنے۔ جیسے میں ایک نئی دنیا میں آ گیا تھا۔

اور پھر ۱۹۵۳ء میں جب میں پہلی بار کالج کے طلبا کے ساتھ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے تعلیمی دورے پر گیا۔ تو وادی سے باہر جموں کے علاقوں میں قدم رکھ کر میں ہر چیز کو استعجاب سے دیکھتا رہا۔ سوکھے سڑیل لوگ، سیاہ فام، مختلف لباس، مکانوں کی ساخت مختلف، اور پھر پیڑ پتے ـــ عجیب، نوکیلے، خاردار، دھوپ کی شدت ـــ وادی کی گلپوش اور شاداب فضا سے یہ دنیا کتنی مختلف تھی ـــ

ہم طیارے کے زینوں سے اُتر آئے

ابھی میں نے زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی آنکھوں میں جگمگاہٹ اور چہرے پر پر تپاک تبسم کے ساتھ نظر آئے۔ شگفتہ رنگت اور دراز قد کے مالک جمیل جالبی کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ ایلیٹ کے مضامین کے تراجم سے وہ اردو دنیا میں وارد ہوئے تھے اور پھر اردو ادب کی پہلی ضخیم اور تحقیقی تاریخ لکھ کر اپنے لئے دوام حاصل کیا ہے، وہ وفد کے اراکین سے گلے لگ رہے تھے۔ انہوں نے فرطِ محبت سے بیدی صاحب کو گلے لگایا اور پھر نارنگ صاحب کو، اور پھر مجھے۔

"آیا حامدی کاشمیری صاحب ـــ!" انہوں نے جذباتی لہجے میں کہا، اور ہم دونوں زور سے گلے ملے۔ وی آئی پی لاونج میں داخل ہوتے ہی میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا، جن میں خواتین قلمکار بھی شامل تھیں ایک بڑا مجمع ہمارے استقبال کے لئے جمع تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کراچی کے سارے سرکردہ قلمکار ائرپورٹ پر جمع ہو چکے ہیں ادیبوں کے علاوہ ہندوستانی سفارت خانے کے قونصلر اور دیگر اہلکار بھی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ بیدی صاحب نے وفد کے اراکین کا تعارف کرایا۔ میں جمیل جالبی کے علاوہ جمیل الدین عالی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور محسن بھوپالی سے گلے ملا۔ بیدی صاحب کے علاوہ وہ نارنگ صاحب اور جگن ناتھ آزاد سے یوں مل رہے تھے، جیسے آشنا آشنا سے ملتا ہے۔ میں دہلی میں افسانے

کے ہند و پاک سیمنار میں جو ڈاکٹر نارنگ نے جامعہ ملّیہ کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۸ء میں منعقد کروادیا تھا، جمیل الدین عالی سے مل چکا تھا۔ اور اسی سیمنار میں میری ملاقات وزیر آغا اور انتظار حسین سے بھی ہوئی تھی۔ یہ ملاقاتیں بالکل لمحاتی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی، صبح سے شام تک سیمنار کی نشستیں تھیں۔ اور پھر استقبالیے اور دعوتیں اور پھر جو وقت بچتا تھا اُس میں اُن کے متعدد چاہنے والے ان کو گھیر رکھتے تھے۔

مارچ ۱۹۸۵ء میں جو سیمنار ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کے بارے میں اردو اکاڈمی دہلی کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر نارنگ کی نگرانی میں منعقد ہوا تھا اس میں میری ملاقات جمیل الدین عالی، کشور ناہید، حسن رضوی، افتخار عارف، سید عاشور کاظمی، محسن بھوپالی، سلیم کوثر اور دیگر حضرات سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے میری ملاقات غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمنار میں کئی برس پیشتر ہوئی تھی۔ فرمان صاحب بیحد خلوص و محبت سے ملے تھے اور دل پر اُن کی محبت کا نقش گہرا تھا۔ کراچی کے ائرپورٹ پر اور بھی کئی ادیب تھے۔ جن سے چائے نوشی کے دوران میں گفتگو ہی، سبھی لوگ ہماری آمد پر غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

"میں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں" فرمان فتح پوری پاکستان کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات برسوں سے پڑھتا آیا تھا، وہ نگار کے مدیر، اردو ڈکشنری بورڈ کے سیکرٹری اور شعبہ اردو کراچی کے پروفیسر ہیں۔ بڑھے ہوئے سفید بال مگر چہرے پر رونق اور درخشندگی، متحرک، جوشیلے اور شگفتہ کلام۔

ڈکشنری بورڈ کے چیئرمین، اظفر صاحب سے میری ملاقات ہوئی وہ بار بار دھیمے لہجے میں اپنی محبت اور مسرت کا اظہار کرتے رہے۔

"بھارتی ادیبوں کے آنے سے دونوں ملکوں کی دوستی اور مضبوط ہوگی۔"

وہ پورے وثوق سے کہہ رہے تھے۔ جیسے انہیں پورا یقین تھا کہ اب دوستی اور قربت کے ایک

روشن دور کا آغاز ہوگا۔ اظفر صاحب دُبلے پتلے پست قد کے شخص ہیں مگر لہجے میں عظیم انسانی محبت کا استحکام ہے وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ متین، علم دوست اور آہستہ گو اظفر صاحب سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔

مریم صوفہ پر بیٹھی پروین شاکر، ڈاکٹر عالیہ امام اور بیگم ممتاز راشدی سے باتیں کر رہی تھیں۔ پورے لاؤنج میں زندگی ہی زندگی تھی۔ زندگی کی گہما گہمی اور رونق، باتیں، مسکراہٹیں قہقہے، میں رئیس امروہی، ڈاکٹر اسلم فرخی، مظہر یوسف اور حسن بھوپالی کے علاوہ ہندوستانی سفارت خانے کے ڈپٹی قونصل جنرل شری بنرجی اور پریس قونصل، جی، آر، شرما سے مل چکا تھا۔ ان کے علاوہ فرسٹ سیکرٹری شری کرشن جین سے بھی ملاقات ہوئی تھی، یہ حضرات اپنے ہموطنوں کی عزت افزائی کو دیکھکر مسرور تھے

"اپنے اپنے سامان کو پیک کیجئے"

چترویدی کہہ رہے تھے۔ دُبلے پتلے سیدھے سادھے سے انسان ہمارے ہمسفر، ایجوکیشن منسٹری میں سیکشن آفیسر۔

"کوئی ضرورت نہیں، سامان ہوٹل پہنچایا جارہا ہے" یہ غلام ربّانی آگرو صاحب تھے۔ لمبے قد کے بھرے بھرے جسم کے شخص، سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں سفید اچکن میں ملبوس، معلوم ہوا کہ آگرو صاحب پاکستانی ادبیات اردو کے ڈائریکٹر جنرل ہیں وہ اسلام آباد سے تشریف لائے تھے اور وہی اپنے دفتر کے عملہ کے ساتھ پاکستانی حکومت کی جانب سے میزبانی کے فرائض انجام دینے والے تھے۔

میں نے اسلم فرخی سے کہا۔

"آصف فرخی سے ملنا ہے۔ ان کے لئے عبید صدیقی کا خط ہے"

"وہ خود ملنے آئیں گے۔"

ہم لاؤنج سے باہر نکل آئے۔

ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا قافلہ ہمارے ساتھ ساتھ ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا. سامنے سڑک پر کاروں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ ہم نکلے تو ڈرائیوروں نے کاروں کے دروازے کھولے۔

اگرو صاحب اور اُن کے دفتر کے اراکین، وفد کے ممبروں اور دیگر معززین کو کاروں میں بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ پہلی کار میں وفد کے رہنما بیدی صاحب اگلی نشست پر براجمان ہوئے اور پچھلی نشست پر ڈاکٹر نارنگ میں اور مریم بیٹھ گئے۔

عمارت کے برآمدے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پی آئی اے کے عملے کے لوگ، سپاہی، مسافر، ان کے عزیز و اقارب، برقعہ پوش خواتین!

کاروں کا جلوس روانہ ہوا۔

ہماری کار کے آگے آگے پائلٹ جیپ سائرن بجاتی ہوئی، برق رفتاری سے جاری تھی اور کشادہ، روشن اور صاف ستھری سڑکوں پر ہماری کار رنگ بھگ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی، میں سوچ رہا تھا ؎

گلشن میں بند و بست برنگ دگر ہے آج

اب اِکّا دکا راہگیر بھی دکھائی دینے لگے۔ جو سائرن کی آواز سے چونک کر کاروں کے جلوس کی طرف دیکھتے۔ کہیں کوئی پیڑ یا سبزہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پاکستانی سرکار اور ادیبوں کی طرف سے عدیم المثال استقبال اور عزت افزائی سے احساس تشکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"حامدی صاحب، آپ پاکستان پہلی بار آئے ہیں" بیدی صاحب نے پوچھا، ان کے چہرے پر روشنی زیادہ ہو گئی تھی۔

"جی ہاں"

"دیکھئے، کتنی شفاف اور کشادہ سڑکیں ہیں، کراچی بالکل جدید شہر ہے۔"

"ٹریفک بے حد FAST ہے" نارنگ صاحب نے کہا۔

سڑکوں پر تیز رفتار چمکتی ہوئی کاریں آجا رہی تھیں کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔
البتہ بیچ بیچ میں بسیں نظر آتی رہیں۔
چھوٹے سائز کی قدیم ساخت کی بسیں، بسوں کی دھج عجیب سی تھی۔ صندوق نما، باہر سے دیواروں اور مڈ گارڈ پر گلکاریاں کی ہوئیں۔ دلہن کی طرح سجی سجائی رنگین ؎

چشم نقش قدم آئینہ بخت بیدار

"یہ بسیں مقامی کلچر یعنی سندھی کلچر کا عکس پیش کرتی ہیں" بیدی صاحب نے کہا "بالکل مختلف ساخت کی بسیں ہیں"۔ مریم اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں بیدی صاحب اور نارنگ صاحب دونوں حضرات کو پاکستان آنے کی سعادت بار بار حاصل ہوئی تھی۔ بیدی کا مولد تو پاکستان ہی ہے وہ ایک بڑے جاگیردارانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقسیم کے بعد وہ ہندوستان منتقل ہوئے لیکن ایک مشہور اور متمول گھرانے کے چشم و چراغ ہونے اور پھر اپنی باغ و بہار شخصیت کی بنا پر وہ پاکستان کے بارسوخ اور صاحب اقتدار لوگوں میں خوب جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ پاکستان جاتے ہیں تو ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے نارنگ صاحب بھی بارہا پاکستان گئے ہیں وہ یہاں کے ادبی حلقوں تک بے حد مقبول و محترم ہیں اور بحیثیت نقاد اعتبار و استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کی ادبی انجمنیں اور ادارے ان کو توسیعی خطابات کے لیے بھی مدعو کرتے ہیں گذشتہ سال انجمن ترقی اردو نے انہیں میر پر توسیعی خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ان کا مولد بھی پاکستان سندھ ہے۔

میں اور مریم پہلی بار سرزمین پاکستان پر قدم رکھ چکے تھے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا* اس لیے کہ ہمارے دورۂ پاکستان کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا، ہمارا کوئی رشتہ دار پاکستان میں اقامت گزیں نہ تھا۔ اس لئے قرابت داری کی بنا پر ویزا کی حصولی نا ممکن تھی۔
فاطمہ جناح روڈ تک آتے آتے شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ ٹریفک کا دباؤ بڑھ

* کہ ہم وارد پاکستان ہو چکے ہیں۔

چکا تھا۔ فٹ پاتھوں پر لوگوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ اکثر و بیشتر لوگ پاکستانی لباس یعنی قمیض شلوار اور واسکٹ میں ملبوس تھے۔ چوراہوں پر پائیلٹ کے سائرن سے ٹریفک رک جاتا اور رکی ہوئی کاروں سے لوگ ہمارے قافلے کو متجسس نظروں سے دیکھتے تھے۔ کہیں کہیں روشنیاں جل چکی تھیں اور سڑک کے ہجوم کو چیرتے ہوئے پائیلٹ جیپ اور ہماری کار سڑکوں کے دو تین موڑ کاٹ کر اونچائی کو طے کر کے جدید وضع کے بنے ہوئے ایک عالیشان ہوٹل یعنی آواری ٹاورس کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے تیزی سے اتر کر کار کی کھڑکی کھول دی۔ سامنے ایک خوبرو اور خوش وضع شخص نے بہت تپاک سے بیدی صاحب سے ہاتھ ملایا اور معلوم ہوا کہ یہ AVARITOWERS RAMADA RENAISSANCE HOTELS کے سیلز مینجر سلطان ہاشمی ہیں۔ وفد کے اراکین اگرو صاحب کی رہنمائی میں لفٹ کے ذریعے وسیع جگمگاتے ہوٹل کی سب سے اونچی منزل پر پہنچ گئے۔

ایک وسیع روشن ہال میں وفد کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ دائیں جانب ٹیبل پر چائے اور ناشتے کا سامان سجا ہوا تھا۔ بائیں جانب صوفے، کرسیاں اور ٹیبل ہوائی اڈے پر جو معززین ہمارے خیر مقدم کے لیے حاضر تھے۔ وہ ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ میں اظفر صاحب سے ہمکلام تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اردو ڈکشنری بورڈ کے زیر اہتمام لغات کے پروجیکٹ کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ اس پروجیکٹ کی تعریفیں میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ اردو میں ایک جامع اور مستند لغت کی کمی کے پیش نظر اس پروجیکٹ کی اہمیت روشن ہے۔ اظفر صاحب اس کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ مسن بھوپالی بہت پھرتی سے مہمانوں سے مل رہے تھے۔ مجھ سے پھر ہاتھ ملا کر انہوں نے دہلی میں ہماری پچھلی ملاقات کی یاد تازہ کی۔ اگرو صاحب فرداً فرداً مزاج پرسی کر رہے تھے اور محبت اور خلوص سے مہمانوں کو کھلا رہے تھے۔

"حامدی کاشمیری صاحب آپ نے دہلی میں وعدہ کرنے کے باوجود ناصر کاظمی والی

کتاب نہیں دی ہے" محسن بھوپالی نے شکایت کی۔

"بھائی اب کتاب لے کر خود آپ کے پاس آیا ہوں" میں نے کہا۔ وہ ہنسے۔

بے حد پر تکلف چائے سے ہماری تواضع ہو رہی تھی۔ مریم خواتین سے گفتگو کر رہی تھیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لوگ قاید وفد بیدی صاحب کو ایک طرف لے جا کر ان سے انٹرویو لے رہے تھے۔ اخبارات کے نمائندے استقبالیہ کی تقریب کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ایک ٹیبل پر نارنگ صاحب، عالی صاحب، جمیل جالبی، فرمان فتح پوری، رئیس امروہی اور دیگر حضرات سے محو سخن تھے۔ میں ہال کے کنارے اونچے شیشوں کی کھڑکیوں کے ساتھ استادہ دور دور تک چراغوں کے شہر کو حیرت اور مسرت سے دیکھنے لگا۔ مکانوں، دکانوں، سڑکوں اور شاہراہوں کی لاتعداد روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے شہر کو میں بصد اشتیاق دیکھ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں آسمان کی بلندیوں پر ہوں اور نیچے روشن ستاروں کا ایک پُراسرار الیف لیلوی دیار آباد ہے۔ حقیقت خواب میں تبدیل ہو رہی تھی تخلیق شعر کی کیفیت میں کبھی کبھی میری جاگتی آنکھوں میں کسی پُر نور اجنبی بستی کا خواب لہرا جاتا تھا میں صدیوں کے سفر کے بعد اس کے قریب پہنچتا لیکن اس پر قدم رکھتے ہی میرا خواب ٹوٹ جاتا۔

نظر آئے گی اک پُر نور بستی
قدم رکھ دیجئے معدوم ہوگی

لیکن آج حد نگاہ تک جو پُر نور بستی جاگ رہی تھی وہ خواب نہیں، حقیقت ہے اور حقیقت خواب بن رہی ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ساتھ کھڑے ابوالفیض سحر اور چندر ویدی کو یہ نظارہ دیکھنے کو کہا۔ دونوں حضرات اس نظارے میں کھو گئے۔ ان کو اپنے عالم میں چھوڑ کر میں نے مریم کو بلایا۔ وہ بھی اشتیاق سے دیکھنے لگیں۔

"کتنا آباد اور روشن شہر ہے" وہ کہنے لگیں۔

نیچے کونٹر سے ہوٹل کا آفیسر آیا اس کے ہاتھوں میں چابیاں تھیں وہ وفد کے اراکین کے نام ٹائپ شدہ کاغذ پر چیک کرکے ایک ایک فرد کو چابی پیش کرنے لگا ہم کو کمرہ نمبر ۲...۱ کی چابی پیش کی گئی، کچھ دیر کے بعد استقبالیہ جو پاکستان اکادمی آف لیٹرز اور استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے دیا گیا تھا، اختتام پذیر ہوا۔ ایرپورٹ پر بھی استقبالیہ کمیٹی کے سبھی ارکان موجود تھے، کمیٹی جمیل جالبی، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔

اگرو صاحب ہدایات دے رہے تھے۔

"آپ حضرات و خواتین اپنے اپنے کمروں میں آرام کیجیے۔ سامان پہنچ چکا ہے آپ کے لیے ڈنر کا انتظام یہیں ہوٹل میں کیا گیا ہے۔"

ہم لفٹ کے ذریعے دسویں منزل میں آ گئے، جگن ناتھ آزاد کے کمرے کے متصل ہمارا کمرہ تھا۔ مقابل میں نارنگ صاحب اور زیدی صاحب کے کمرے تھے اور اسی جانب دوسرے اراکین کے کمرے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے کمروں کے باہر قالینوں سے آراستہ، کشادہ راہداری میں اپنے اپنے سامان کی نشاندہی کی، ہوٹل کے وردی پوش بوائے بڑی پھرتی سے ہمارے سامان کو کمرے میں پہنچانے لگے، کمرے میں قدم رکھتے ہی آسودگی، فرحت اور اطمینان کا گہرا احساس ہوا ـــــ انتہائی خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ کمرہ، مریم نے سامان کا جائزہ لے کر اٹیچی کھول دی۔ میں ایزی چیئر پر بیٹھ کر سستانے لگا اور کمرے کی آرائش اور خوبصورتی کو دیکھنے لگا۔ فرش پر نرم و گداز قالین، بیڈوں پر قیمتی پھولدار بیڈ کور، سرہانے ٹیلی فون، ٹی پائی، ریڈیو گرام، بیڈ سائیڈ لیمپ، بائیں طرف خوبصورت شیڈ میں قدم آدم لیمپ، رنگین ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، بار، ٹیبل پر بید کی کشتی نما ٹوکری میں تازہ پھل، سیب، امرود، انگور، کیلے، سنترہ اور چیکو، سامنے ٹیبل پر لیٹر پیڈ اور فائل کور، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن بھوپالی اور فرمان فتح پوری تھے اور ان کے

پیچھے پیچھے جمیل الدین عالی ــــ
"سب ٹھیک ہے نا؟ کوئی دقت ہو تو بتایئے۔" فرمان فتح پوری نے کہا۔
"آپ کی محبت ہے!" میں نے کہا۔
جمیل الدین عالی کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی، میں نے اُن سے کہا۔
"عالی بھائی! آپ نے دہلی میں مجھے پاکستان آنے کی دعوت دی تھی ــــ خدا کا شکر ہے کہ میں آگیا ہوں۔ یہ آپ کے سچے مخلصانہ جذبے کا ہی معجزہ ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"
"آپ کی محبت ہے کہ آپ تشریف لے آئے" انہوں نے بھرپور شفقت سے کہا۔

عالی صاحب نے اپنی بے مثال محبت سے مجھے دہلی میں مارچ ۱۹۸۵ء میں منعقدہ نئے افسانے کے سیمنار میں اپنا گرویدہ بنالیا تھا، وہ پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے غالب اکیڈمی میں منعقدہ سیمنار کی مختلف نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ ان کے ساتھ اور دیگر حضرات بھی تھے۔ جس روز سہ پہر کی نشست میں صدارت مجھے تفویض ہوئی، پاکستانی وفد کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن جب آخری افسانہ پڑھا جانے لگا۔ تو پورے کا پورا وفد ہال میں داخل ہوا۔ ان کے لئے سامنے کی کرسیاں خالی کی گئیں اور سب کے سب براجمان ہوئے۔ افسانے کے بارے میں سوال و جواب کے بعد مجھے دعوت دی گئی کہ میں صدارتی کلمات کا اظہار کروں میں نے اس نشست میں پڑھے گئے افسانوں کے بارے میں ساری بحث کو سمیٹا، نئے افسانے کے مسایل کے تعلق سے چند خیالات کا اظہار کیا جلسے کے اختتام پر جب میں ڈائس سے ہال میں اترا۔ تو سب سے پہلے جمیل الدین عالی نے مجھے گلے لگایا اور جوشیلے لہجے میں کہا۔
"حامدی کاشمیری صاحب، واہ کیا تقریر کی آپ نے!" "جی ــــ؟"

"بھئی حامدی کاشمیری صاحب! ہم آپ کو پاکستان بلائیں گے۔"

میں حیران ہوا۔ یہ الطاف وکرم میرے لئے غیر متوقع تھا اور پھر مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی اور پھر وفد کے دیگر اراکین نے بھی رواداری میں چند توصیفی فقرے کہے۔

حق تو یہ ہے کہ اس روز میں نے ان حضرات کی تعریفوں کو رسمی تعریفوں پر ہی محمول کیا۔ لیکن دوسرے روز جب ڈاکٹر نارنگ سے غالب اکاڈمی میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔

"عالی بھائی رات دیر تک آپ کا ذکر کرتے رہے۔ وہ آپ کو پاکستان بلا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا حامدی کاشمیری کو ویزا کی کوئی دقت تو نہیں آئے گی۔ میں نے کہا۔ وہ ہم پر چھوڑیے ہم سب ٹھیک کریں گے"

اور میں نارنگ صاحب کی جانب حیرت زدہ دیکھتا رہا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا شفیق اور مہربان دوستوں سے خالی ہوگئی ہے"۔

## ۵ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

زندگی میں، میں نے بارہا یہ شدت سے محسوس کیا ہے کہ دوستی اور محبت کے رشتے مصنوعی اور کھوکھلے ہو کے رہ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ خونی رشتے بھی اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ موجودہ میکانکی دور میں انسان تمام انسانی اقدار سے لاتعلق ہو کر ایک بے چہرہ معاشرے کا خودکار اور خود غرض حصہ بن کے رہ گیا ہے۔ نفسانفسی کے عالم میں شرافت، محبت، خلوص اور ایمانداری کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے یہ دنیا واقعی جینے کے لائق نہیں رہ گئی ہے لیکن — لیکن کسی نادر لمحے میں غیر متوقع طور پر کوئی شفیق اور مہربان چہرہ سامنے آیا ہے۔ کوئی مخلص انسان، اور اس نے میری جانب خلوص اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ایسے لمحوں میں مجھے مسرت سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، کیا اب بھی نفرت، عداوت اور خود غرضی کی تاریکی میں کوئی دل محبت، یگانگت اور ایثار کی روشنی سے منور ہے؟ کتنے ظالم ہیں ایسے لوگ کیونکہ

وہ موجودہ حیات کُش ماحول میں جینے کی تحریک دیتے ہیں۔

عالی بھائی مجھ سے رخصت ہو کر نارنگ صاحب کے کمرے میں گئے۔ میں نے اپنے کمرے میں کھڑکی پر لگے بھاری قیمتی پردے کو تھوڑا سا سرکایا تاکہ شہر فروزاں کی جھلک پھر دیکھ لوں اور دل و دماغ کو منور کروں۔ کراچی کا وسیع و عریض شہر روشنیوں کی کثرت سے پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔

"بیدی صاحب کے کمرے میں محفل جم رہی ہے" ابوالفیض سحر آئے "آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

میں ابوالفیض سحر کے ساتھ وہاں پہونچا، وہاں استقبالیہ کمیٹی کے بعض اراکین اور ہندوستانی سفارت خانے کے شرما صاحب اور جین صاحب کے علاوہ بعض اور حضرات بھی فرد کش تھے۔ بیدی صاحب میر مجلس تھے۔ وہ پوری آسودگی اور طمانیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ وہ لطیفوں پر لطیفے سنا رہے تھے۔ اور کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ آزاد صاحب اور مسعود صاحب کے بغیر سبھی احباب جمع ہو چکے تھے۔ چترویدی نے کہا۔

"آزاد صاحب کا دانت دہلی میں ٹوٹ گیا تھا وہ ڈاکٹر کے ساتھ دانت لگوانے گئے ہیں اور مسعود صاحب اپنے کمرے سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔"

بیدی صاحب کی محفل کچھ دیر عروج پر رہنے کے بعد برخاست ہوئی۔ پرواز کا وقت ہو رہا تھا۔ میری توجہ بار بار مسعود صاحب کی طرف جا رہی تھی۔ سامان کی شناخت کرتے ہوئے ان کی اٹیچی غائب تھی۔ وہ ہر جگہ اٹیچی کو تلاش کرتے رہے۔ ان کی تشویش کے ساتھ ہی میری تشویش بھی بڑھ رہی تھی۔ لیکن اگر د صاحب کے دفتر کے لوگ بشمول انصاری صاحب ان کو تسلی دیتے رہے کہ ان کی اٹیچی کہیں نہیں جائے گی۔ سارا سامان ایئرپورٹ سے بہ حفاظت آگیا ہے۔ میں نے ان کے دروازے پر دستک دی اور اٹیچی

کے بارے میں پوچھا۔" ابھی تک تو نہیں ملی" انہوں نے جواب دیا۔

میں حیران تھا کہ سارے سامان میں صرف ان کی اٹیچی کہاں غائب ہوئی۔ نارنگ صاحب کے کمرے میں جہاں عالی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ گم شدہ اٹیچی کا ذکر رہا۔ عالی صاحب نے کہا کہ اٹیچی کے گم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ نارنگ صاحب کے بیڈ پر لیٹے لیٹے ان سے نجی معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔

میں اپنے کمرے میں آیا' اتنے میں شہزاد منظر آئے۔ ان سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ افسانے پر ان کی کتاب جو ازراہ عنایت انہوں نے میرے لئے سرینگر کے ایڈریس پر بھجوائی تھی۔ نظر سے گزری تھی۔ جدید اردو افسانے کے مسائل ور جحانات کے بارے میں کافی غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ اور وہ میرے سامنے ایستادہ تھے۔ سراپا شفقت' لہجہ خلوص اور اپنائیت سے معمور!

"حامدی کاشمیری صاحب! آپ سے انٹرویو لینا ہے۔ کل صبح حاضر ہو جاؤں گا موقع کا فایدہ اٹھاؤں گا۔ کل سے آپ سب بے حد مصروف رہیں گے۔ پھر تو آپ سے ملنا بھی مشکل ہوگا۔" انہوں نے اپنی کتاب ردِّ عمل (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) دی۔ اس سے قبل شاہد اورری صاحب آئے تھے اور انہوں نے قطعات کا مجموعہ "چراغ سے چراغ" دے دیا اور کتاب کے بارے میں رائے لکھنے پر اصرار کیا

ہم لوگ ہوٹل کے بڑے ہال میں رات کا کھانا کھانے لگے۔ انتہائی پُر تکلف' متنوع اور لذیذ ضیافت! دعوت میں ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ عمائدین شہر' صحافی اور سرکاری آفیسر بھی موجود تھے۔ مہمان خصوصی حکیم صاحب تھے۔ جو پاکستان میں ہمدرد دواخانے کے منتظم ہیں۔ کھانے کے بعد دیر تک باتیں گپ شپ اور لطیفے ہوتے رہے۔ مریم' مسز خالد اطہر سے باتیں کرتی رہیں۔ خالد اطہر نوجوان ادیب اور صحافی ہیں ـــــــ خوبرو' ذہین اور فعال' ان سے مل کر دلی خوشی کا احساس

ہوا۔ وہ روزنامہ جنگ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ بیدی صاحب کا انٹرویو لینے کے بعد وہ مجھ سے ہمکلام ہوئے۔ ہال سے باہر نکل کر مندوبین کے ساتھ کئی تصویریں لی گئیں۔ سونے سے پہلے بیدی صاحب نے خود دروازے پر آکر اطلاع دی کہ اگلے روز یعنی ۸ جنوری کو صبح نو بجے قایدِاعظم کے مزار پر فاتح خوانی ہوگی۔ وہ ٹھیک نو بجے تیار رہنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

## بدھوار ۸ جنوری

بستر سے اٹھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ کمرہ بہت گرم ہے اور حبس کا احساس ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً دیوار پر ہیٹنگ سوئچ آف کر دیا۔ سامنے دروازے کے نیچے فرش پر اخبار پڑا تھا۔ میں نے اخبار کے پہلے ورق پر نظر ڈالی۔ دیگر سرخیوں اور تصویروں کے علاوہ وفد کے اراکین اور میزبانوں کا گروپ فوٹو اس شہ سرخی کے ساتھ چھپ چکا تھا۔

"پاک بھارت تعلقات کے فروغ میں بڑے پیمانے پر ادیبوں کا تبادلہ ہونا چاہیئے"۔ اخبار میں بیدی صاحب کے انٹرویو کی وہ پوری تفصیل درج تھی جو ان سے خالد اطہر نے ایئر پورٹ کے وی آئی پی لاونج میں لیا تھا۔ بیدی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔

"ہم جب بھی پاکستان آئے ہیں تو ہمارا اول و آخر مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم ایسی فضا پیدا کریں۔ جس سے دونوں ملکوں کے عوام بالعموم اور اہلِ قلم بالخصوص ایک دوسرے کے اور قریب آسکیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں بہت خوشی ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان ہماری میزبانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ بیدی صاحب نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کے دوروں سے نہ صرف تعلقات کو بہتر بنانے میں بلکہ اردو ادب کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی۔"

انہوں نے مزید کہا تھا "ہم پانچ ہزار اردو کتابیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ جن کی نمائش ہوگی اور جو بعد میں ہم حکومت پاکستان کو بطور تحفہ پیش کریں گے"۔

ہم نے آٹھ بجے صبح کمرے میں ناشتہ منگوایا، ناشتے کا کارڈ ہم دروازے پر لٹکانا بھول گئے تھے۔ اس لئے ٹیلیفون کا سہارا لینا پڑا اور بہت جلد ناشتہ آگیا۔ انڈے۔ شہد، ٹوسٹ مکھن اور جام، ہم ساڑھے آٹھ بجے تیار ہوکر صبح کی بلگی روشنی میں کراچی کے شہر کو دیکھتے رہے، سڑکوں پر کاریں کھلونوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ دھند چھٹ رہی تھی اور کنکریٹ کے مکانوں کی قطاریں دور دور تک نظر آرہی تھیں۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

سامنے بیدی صاحب مسکرا رہے تھے

"ٹھیک ساڑھے نو بجے ہم ہوٹل سے مزار قاید اعظم جا رہے ہیں"۔

"ہم کمر باندھے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"خوب! آپ ابوالفیض صاحب سے کہیئے وہ دوسرے حضرات کو بھی اطلاع کریں"۔

اتنے میں ابوالفیض سحر چترویدی کے ساتھ اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ وہ شیروانی پاجامہ اور جناح کیپ پہنے ہوئے تھے۔

"واہ، بہت سمارٹ لگ رہے ہیں"۔

"جی ہاں جیسا دیس ویسا بھیس"۔

"بھیس بدلنے میں آپ کمال رکھتے ہیں"۔ ہمارا قہقہہ بلند ہوا۔

چترویدی نے اطلاع دی کہ اگرو صاحب نے کل رات کہا تھا کہ پاکستان میں وفد کے لئے قیام و طعام اور سفر کے جملہ انتظامات وہ خود کر رہے ہیں۔

"جہاز سے اترنے کے بعد سے ہم حکومت پاکستان کے مہمان ہیں ـــ"

فیض صاحب نے اس خوش خبری کی تکمیل کی۔

"یہ بڑی عزت افزائی ہے۔" میں نے کہا۔

اتنے میں شہزاد منظر اور ان کے ریسرچ اسکالر دوست آئے۔

"حامدی کاشمیری صاحب انٹرویو ہو جائے۔"

"ضرور!"

ہم کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے۔ انہوں نے ٹیپ ریکارڈر سامنے رکھا۔ اور سوالات پوچھنا شروع کئے میں جوابات دیتا رہا۔ لیکن میں ادھیڑ بن میں تھا کہ نو بجنے والے ہیں اور ٹھیک نو بجے ہمیں لاونج میں رپورٹ کرنا ہے ابھی میں نے صرف چند سوالات یعنی عصری تنقید اور تخلیقی ادب میں علامت نگاری اور ترسیل سے متعلق سوالوں کے جوابات ہی دیئے تھے کہ باہر سے بلاوا آگیا۔ "آپ چلئے، ہم بھی چلتے ہیں یہ انٹرویو بلاقساط ہو گا۔ مزار جناح تک کار میں اس کا ایک حصہ مکمل ہو جائے گا"۔ شہزاد منظر نے کہا۔

لاونج میں ارکان وفد جمع ہو چکے تھے، صرف فہمیدہ بیگم اور رفیعہ سلطانہ کا انتظار تھا اتنے میں چائے آگئی۔ آوری ٹاورس کا لاونج کافی کشادہ ہے۔ ویٹر بڑی مستعدی سے آجا رہے تھے، غیر ملکی سیاح بھی بعض صوفوں پر براجمان تھے۔ انصاری صاحب نے اطلاع دی کہ اگرو صاحب کراچی میں وفد کی مصروفیات کے بارے میں ضروری ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد فہمیدہ بیگم اور رفیعہ سلطانہ نئی ساڑھیوں میں ملبوس لاونج میں آگئیں۔

مسعود صاحب اور خلیق انجم سرگرمی سے محو گفتگو تھے، مسعود صاحب کو گمشدہ اٹیچی مل چکی تھی۔ ان کی اداسی کافور ہو چکی تھی۔ اٹیچی آزاد صاحب کے سامان کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئی تھی "شکر ہے اٹیچی آپ کو مل گئی"۔

"جی ہاں، مل تو گئی لیکن ——— لیکن میری ہی اٹیچی غائب کیوں ہو گئی تھی۔ اصل میں بات یہ ہے۔" وہ رک کر بولے۔

"برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر" —— ان کی حس مزاح عود کر آئی تھی۔
بیدی صاحب چاق و چوبند اور بشاش تھے' وہ لطیفے سنا رہے تھے آزاد صاحب
نیا دانت لگنے کے بعد خاصے صحت مند نظر آ رہے تھے۔ نارنگ صاحب خوبصورت
سوٹ پہنے بیدی صاحب کے لطیفوں سے محظوظ ہو رہے تھے' بیدی صاحب
کہہ رہے تھے'

"ایک واقعہ سنئے"

"واقعہ ؟"

"جی ہاں" یہ واقعہ ہی ہے" انہوں نے توقف کیا
یہ میرے ساتھ پیش آیا ہے' ایک پٹھان نے پوچھا بیدی صاحب دن کے بارہ بجے
کیا کیا ہوتا ہے" ؟

"میں نے کہا' کچھ نہیں"
اُچھا کچھ نہیں ہوتا ہے اُس نے پوچھا
"ہاں کچھ نہیں ہوتا"
چلو مان لیتے ہیں لیکن کیا رات کے بارہ بجے کچھ ہوتا ہے ؟
نہیں'
لیکن ہمارے یہاں ایک سردار صاحب رہتے ہیں ان کو رات کے بارہ بجے
کچھ ہوتا ہے۔

پھر تو وہ ضرور پٹھان نسل ہو گا۔
محفل قہقہہ زار بن گئی'
تھوڑی دیر میں یہ محفل قہقہہ محفل مباحثہ میں بدل گئی۔ کراچی میں چار روزہ قیام کے
دوران میں پروگرام کے مطابق دو دن لگاتار سیمینار کا انعقاد ہونا تھا تجویز پیش کی گئی

کہ سیمنار ایک ہی روز منعقد ہوتا کہ دوسرا دن یا دن کا کچھ حصہ گھومنے گھامنے کے لیے رہے تجویز کو پیش کرنے میں خلیق انجم پیش پیش تھے۔ بیدی صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس مسئلے پر اگروصاحب سے بات کریں گے۔ اگرو صاحب خندہ پیشانی کے ساتھ آئے انہوں نے دیر سے آنے کی معذرت کی اور فوری روانگی کے لیے کہا میں اور مریم ایک کار میں بیٹھے شہزاد منظر میرے ساتھ ہی بیٹھے۔ انہوں نے ٹیپ ریکارڈ آن کیا۔

سیکیورٹی پولیس کے ہمراہ کاروں کا قافلہ روانہ ہوا سب سے آگے وہ کار تھی، جس میں بیدی صاحب، نارنگ صاحب اور اگرو صاحب بیٹھے تھے، کئی پرہجوم چوراہوں سے گزر کر کار ہوا کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ میں ہندو پاک میں جدید افسانے کے مسایل کے بارے میں شہزاد منظر کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔

مزار جناح کے گیٹ کے اندر اراکین وفد محافظ دستے کی رہنمائی میں قطار کی صورت میں صحن کو پار کر کے مزار پر آئے۔ محافظ دستے کے آفیسر نے پھولوں کی چادر کو بصد احترام مزار پر رکھ دیا۔ سب سے پہلے قاری نے کلام مجید کی تلاوت کی۔ پھر ملٹری بینڈ نے ماتمی دھن بجائی، ہم نے فاتحہ خوانی کی، مزار جناح جو عمارت اور گنبد تعمیر ہوا ہے وہ جدید مسلم فن تعمیر کا ایک متاثر کن نمونہ ہے۔ مزار کنکریٹ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ فرش مزار سے گنبد تک کی اونچائی ½۱۱۱ فٹ ہے۔ گنبد کا DIAMETRE ۷۰ فٹ ہے۔ مزار کی پوری عمارت پاکستان کے سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ قبر بھی سنگ سفید کی ہے، اس کے اوپر گنبد کی چھت سے ایک ۸۱ فٹ لمبا جھاڑ آویزاں ہے۔ جو عجوبۂ روزگار ہے۔ یہ مسلم ایسوسیشن جمہوریہ چین نے ۱۹۷۰ء میں تحفتاً دیا ہے۔ یہ جھاڑ چار طبقوں میں ۴۸ رنگین روشنیوں سے آراستہ ہے۔ اس کی اوپری سطح احمریں ہے۔ قبر کے اردگرد چاندی اور فولاد کا جنگلہ لگا ہوا ہے۔ مزار کے مشرقی طرف

ایک کمرے میں قایدِ اعظم کے RELICS محفوظ ہیں۔

مزار کے اطراف میں گھومنے کے بعد ہم پاکیزہ جذبات کے ساتھ واپس لوٹے۔ کار میں شہزاد منظر مریم سے کشمیر میں اردو زبان و ادب کی تعلیمی اور تدریسی صورت حال کے بارے میں استفسارات کرتے رہے۔ اپنے ادبی مشاغل کے بارے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے شہزاد منظر نے کہا کہ انہوں نے تنقیدی مقالات کے علاوہ ایک ناول بھی لکھا ہے انہوں نے کہا کہ وہ شام کو ناول لے کر آئیں گے۔

ہوٹل کے لاونج میں خالد اطہر کی زبانی معلوم ہوا کہ لنچ ہوٹل میں ہوگا۔ لنچ کے بعد چار بجے لیاقت میموریل لائبریری میں کتابوں کی نمائش ہوگی اور وزیرِ اعظم سندھ جسٹس سید غوث محمد شاہ صاحب نمائش کی رسم انجام دیں گے۔ لنچ کے وقفے سے فایدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے کراچی کے چند مشہور بازاروں کا ایک گشت لگایا۔

خالد اطہر نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہم کو صدر کواپریٹو بازار لے چلے۔ ہم صدر بازار کے علاوہ محبوب مارکیٹ بھی گئے۔ ہم نے رواروی میں محبوب مارکیٹ کو دیکھا، مال و اسباب سے بھری بھری دکانیں، خریداروں کی بھیڑ، عورتیں، مرد ہم نے اونکس کی ایک دکان سے شمعدان، گلدان، فروٹ باولز اور KEY HOLDERS خرید لئے۔ زرِ مبادلہ کی کمی کی بنا پر ہم نے بہت کم قیمت کی یہ چیزیں منتخب کیں۔ ہم چادر کے مطابق پاؤں پھیلا رہے تھے۔ نہیں تو وہاں کیا نہیں تھا؟ عقلمندی تو یہ تھی کہ متنوع قسم کے سامان پر صرف ایک توصیفی نظر ڈالی جائے ؎

مے نگریم و مے رویم

ہم دکاندار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لوٹ رہے تھے کہ ایک فربہ قسم کا توانا شخص پشاوری ٹوپی اور قمیص شلوار پہنے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ ہندوستانی ادیبوں کے ساتھ آئے ہیں؟"

"جی ہاں"۔ میں نے کہا

"ہے بہ ہا چھُس کوتر وارے چھوا؟ بھابی تُہ چھیہ کھوارے؟"۔۔۔ نووارد ٹھیٹھ کشمیری بول رہا تھا، وضع قطع اور لباس کے مختلف ہونے کے باوجود اس کے چہرے کے خدوخال کشمیری النسل ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوا، اور ہمیں بھی اس سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس نے کہا کہ اس کی دکان نزدیک ہی اسی مارکیٹ میں ہے۔ وہ تقسیم کے بعد وارد پاکستان ہوا ہے اور یہیں کا ہو کے رہ گیا ہے اس نے کہا کہ اس نے ہمیں دور سے ہی پہچان لیا تھا۔ اس نے خانقاہِ معلیٰ کو پوری جذباتیت کے ساتھ یاد کیا۔ وہ وہیں پیدا ہوا تھا۔ وہیں پلا بڑھا تھا اور جوانی میں اپنے مولد سے بچھڑ گیا تھا۔ اس نے ہمیں گھر آنے کی دعوت دی۔ مگر ہم نے عدیم الفرصتی کا ذکر کیا اور اس سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ عجیب ۔۔۔ مانوس اجنبی تھا

اس کے بعد ہم پرہجوم سڑک کو عبور کر کے مقابل کی مارکیٹ میں داخل ہوئے یہاں زیادہ تر کپڑے کی دکانیں تھیں۔ مریم نے جاپانی کپڑے کی کئی قسمیں دیکھیں لیکن سرینگر کے مقابلے میں قیمتوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا، ہم جلدی سے نکلے بائیں جانب ڈرائیور کار لے کر آ گیا اور ہم سیدھے اوری ٹاورس پہنچے۔

لنچ پر ڈاکٹر نارنگ صاحب سے جدید تنقیدی رویوں پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اردو کی معاصر تنقید بھی ماقبل کے ادوار کی تنقید کی طرح فن پارے کے بجائے فنکار کو مرکز توجہ بناتی ہے۔ نیز یہ حد درجہ وضاحت و تکرار کی شکار رہے۔ نارنگ صاحب کا خیال تھا کہ کئی نقاد شخصیات پر لکھتے ہوئے تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے رویے میں معروضیت کا فقدان ہے۔ ان کے نزدیک نئے افسانہ نگاروں کے یہاں تخلیقی حسیت تمام و کمال ملتی ہے۔ اس ضمن

میں انہوں نے سریندر پرکاش کے علاوہ انتظار حسین، رشید امجد اور مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا ذکر کیا۔ ہم کچھ دیر تک افسانے میں زبان کے تخلیقی برتاؤ، علامت اور تمثیل اور ہیئتی تنقید کے مسایل پر گفتگو کرتے رہے۔ نارنگ صاحب معاصر ادبی مسایل کے بارے میں خاصا معروضی اور تجزیاتی رویہ روا رکھتے ہیں۔

لیاقت میموریل لائبریری پہونچنے میں خاصی دیر ہوگئی۔ اس سے قبل ہم بھارتی قونصل خانہ گئے۔ وہاں قیصر ادیب ملے۔ دُبلے پتلے، خلوص مجسم۔ قونصل خانے میں چائے سے تواضع کی گئی۔ ہوٹل سے لائبریری کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اگرو صاحب کی قیادت میں ہم لائبریری ہال کی جانب بڑھے۔ باہر کافی لوگ جمع تھے۔ وہ اشتیاق سے وفد کے اراکین کو دیکھتے رہے، اندر ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے باہر کچھ دیر توقف کیا، پھر عزت مآب وزیر اعلیٰ جو پہلے ہی تشریف فرما تھے۔ ہال سے باہر آئے اور بیدی صاحب سے گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ بیدی صاحب نے اراکین وفد کا تعارف کرایا۔ عزت صاحب نے ایک ایک رکن سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

کتابوں کی نمایش کی رسم افتتاح انجام پذیر ہوئی۔ وزیر اعلیٰ کے ساتھ شائقینِ ادب کا ایک بڑا ہجوم کتابوں کو دیکھتا رہا۔ خلیق انجم وزیر اعلیٰ کے ساتھ ساتھ رہے اور کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے رہے۔ بیدی صاحب بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نمایش میں میری تین کتابیں "حرف راز" "اقبال کا مطالعہ" "ناصر کاظمی کی شاعری" اور "نایافت" (شعری مجموعہ) بھی تھیں۔ کتابیں خاصی تعداد میں تھیں اور قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کشمیر کلچرل اکاڈیمی کی بعض مطبوعات بھی نمایش کی زینت تھیں۔ نمایش گاہ میں اردو زبان و ادب کے شائقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ٹیلی ویژن کیمرے

برابر حرکت میں تھے۔ عوث صاحب نے نمائش سے گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ کافی وقت کے بعد وہ دوبارہ ہال میں تشریف لے گئے۔ محسن بھوپالی نے ادبی سیمنار کی افتتاحی کارروائی کا اعلان کیا۔ ڈائس پر وزیر اعلیٰ، استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر جمیل جالبی اور اگرو صاحب کے علاوہ اراکین وفد بیٹھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے قونصل جنرل شری آفتاب سیٹھ بھی تشریف فرما تھے۔ محسن بھوپالی نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ سب سے پہلے مشہور قاری غلام رسول صاحب نے تلاوت کلام پاک کی۔ انہوں نے تلاوت سے پہلے زوردار شکایت کی کہ جلسے کی کارروائی خاصی تاخیر سے شروع ہو رہی ہے۔ انہوں نے وقت اور پابندیٔ وقت کی اہمیت پر زور دیا۔ دیر واقعی ہو چکی تھی۔ اور وزیر اعلیٰ کو بھی انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔ لیکن اس میں ہماری کسی کوتاہی کو دخل نہ تھا کسی انتظامی مجبوری کی بنا پر ہمیں اواری ٹاورس سے لیاقت میموریل ہال پہونچنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ بہر حال قاری نے خشوع و خضوع سے تلاوت کی۔ انہوں نے جس بے باکی سے اپنے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ لائق تحسین تھا۔ تلاوت کے بعد نعت خواں خورشید احمد نے احمد ندیم قاسمی کی نعت سنائی اس کے بعد اگرو صاحب نے استقبالیہ ایڈریس پیش کیا۔ انہوں نے گہرے جذبات و خلوص سے وفد کا خیر مقدم کیا۔ بھارتی ادیبوں کی پذیرائی کرنے پر انہوں نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا۔ "زبانیں تہذیبوں کی سفیر ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم مہمانوں کی آمد کو سفارتی تعلق کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ بھارتی ادیبوں کا یہ دورہ تہذیبی بنیاد پر سفارتی تعلق کا دورہ ہونے کی اہم علامت ہے۔"

اگرو صاحب نے دونوں ملکوں کے ثقافتی، مجلسی اور لسانی رشتوں پر روشنی ڈالی۔ اگرو صاحب کے بعد قونصل جنرل آفتاب سیٹھ نے انگریزی میں تقریر کی۔ انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ بھارت سے ادیبوں اور دانشوروں کا وفد اس وقت

پاکستان کے دورے پر آیا ہے۔ جب دوستی اور خیر سگالی کی فضا زیادہ مستحکم ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک بڑا نقطۂ اشتراک اردو زبان ہے۔ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ دونوں ممالک کی مشترکہ میراث ہے اور اس پر بجا طور پر ہمیں فخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ادیبوں کے وفود کے تبادلوں سے دونوں ممالک ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب آئیں گے۔" آفتاب سیٹھ نے شستہ انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ خوش پوش اور خوش وضع شخص ہیں۔ آفیسرانہ رعونت سے کوسوں دور۔

اس کے بعد وزیر اعلیٰ نے ہندوستانی وفد کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر کے دو ممالک کو قریب لانے میں بھارتی ادبی وفد کی یہ کوشش یقیناً کامیاب ہوگی۔ ادیبوں کے وفود کے تبادلے سے محبت امن اور دوستی کی روایات کی آبیاری ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا "ہماری اور ان کی دو چیزیں مشترکہ ہیں، اردو زبان اور علامہ اقبال"۔ انہوں نے بھارت سے اپنے ملک کے قدیم ثقافتی، سماجی فکری اور ادبی رشتوں پر روشنی ڈالی اور دونوں کی بقا، استحکام اور ترقی کے لیے دوستی اور امن کو ناگزیر قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔ "پہلے بھی ہندوستان سے ادیب اور شاعر آتے رہے ہیں۔ خاص کر بیدی صاحب، نارنگ صاحب اور آزاد صاحب آتے رہے ہیں۔ اقبال صدی سیمنار پر جو اسلام آباد میں منعقد ہوا تھا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا گیا تھا کہ آزاد نے ہندوستان میں اقبال کو دوبارہ زندہ کیا، میں نے کہا کہ انہوں نے اقبال کو دوبارہ زندہ نہیں کیا بلکہ اقبال کی شاعری میں کوئی ایسی قوت ہے جس نے آزاد کو متاثر کیا اور انہوں نے اقبال پر لکھا۔ گویا اقبال نے ان کو زندہ رکھا۔ ان کی اس نکتہ آفرینی پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آخر میں بیدی صاحب نے وفد کا پرتپاک استقبال کرنے پر حکومت پاکستان اور وزیر اعلیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں

نے کہاکہ ادبا، اور شعرا، کو کوشش کرنی چاہیئے کہ جب دو ممالک ایک دوسرے کے قریب آنے لگے ہیں۔ تو ہم انہیں مزید قریب لانے میں ادبی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ انہوں نے کلمات تشکر ادا کرنے کے بعد چند نعتیہ اشعار سنائے۔ اور حاضرین سے داد و تحسین وصول کی ان کے اس شعر پر حاضرین جھوم اٹھے۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

جلسے کے خاتمے پر بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ حمایت علی شاعر سحاب قزلباش، ڈاکٹر جمیل اختر، پروفیسر عتیق، فہمیدہ عتیق، بادشاہ بیگم، لطف اللہ خان وحیدہ نسیم، قیصر ادیب، شہزاد منظر، حیدر علی ملک اور دوسرے۔ باہر لان کے وسیع احاطے میں شامیانہ نصب تھا۔ جہاں عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بہت ہی پر تکلف چائے، سینڈوچ پیٹیز، قسم قسم کی مٹھائیاں ۔ شہزاد منظر نے کہا۔ "حیدر علی ملک آپ سے تفصیلی ملاقات کے خواہش مند ہیں۔" ان سے مل کر دل خوش ہوا۔ انہوں نے کہاکہ وہ میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ حیدر علی ملک سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ ان کے بعض افسانے رسائل میں نظر سے گزرے تھے۔

میں لوگوں کے ہجوم میں نارنگ صاحب کو تلاش کرتا رہا۔ ہم شامیانے سے باہر آکر فٹ پاتھ پر ان کے منتظر رہے۔ ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ بھابی طیبہ سے ملیں گے۔ ہم لیاقت میموریل لائبریری کی اسسٹنٹ لائبریرین سے گفتگو کرتے رہے۔ اتنے میں نارنگ صاحب اپنے مداحوں کے ہجوم سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلایا۔ ہم کار میں بیٹھے۔ فہمیدہ بیگم بھی ہمارے ساتھ آگئیں۔ ان کا خیال تھا کہ سیدھے ہوٹل جائیں گے۔ لیکن ہمارے کہنے پر کہ ہم ڈیفنس سوسائٹی جمیل الدین عالی کے گھر جارہے ہیں۔ وہ بولیں۔ "چلیے میں بھی مل آتی ہوں۔"

کار عالی بھائی کی تھی اور ان کا قدیم معمر بارِیش ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ نارنگ صاحب ان کی مزاج پرسی کر رہے تھے۔ کار کافی فاصلہ طے کر کے جمیل الدین عالی کی شاندار کوٹھی کے احاطے میں رکی۔ یہاں پہلے سے دو کاریں تھیں۔ عالی صاحب کی کوٹھی جدید وضع کی ہے۔ گیٹ سے اندر کا راستہ گیراج کو جاتا ہے۔ اور دائیں طرف کوٹھی کے سامنے ایک بڑا لان ہے۔ جس میں چند پیڑ تھے اور ریتیلی زمین میں کچھ سبزہ بھی نظر آ رہا تھا۔

جمیل الدین عالی کسی فوری کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے تھے۔ واپسی اگلے روز کی تھی۔ ایک خوبصورت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بھابی سے ملاقات ہوئی۔ بھابی نفاست، شائستگی اور شفقت کی پیکر ہیں۔ نارنگ صاحب سے خوب باتیں ہوتی رہیں۔

وہ منورما بھابی کی خیریت معلوم کرتی رہیں۔ انہوں نے ان کو اپنے ساتھ نہ لانے پر نارنگ صاحب سے پُر زور شکایت کی۔ نارنگ صاحب نے کہا وہ دو ہفتے پہلے ہی لاہور آئی تھیں۔ ریاض کے فرزند کی شادی میں شریک ہونے کے لئے۔ بھابی، مریم اور فہمیدہ بیگم سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ ٹرالی پر ان کی بہو چائے لے کر آئیں۔ لیکن ہم نے صرف چائے کا ایک ایک کپ پی لیا۔ پیٹ بھرا ہوا تھا۔ کل شام سے وارد کراچی ہونے کے وقت سے لگاتار کھا پی رہے تھے۔ اور یہ سلسلہ غیر مختتم نظر آ رہا تھا۔ بھابی کے فرزند اور داماد بھی آئے۔ کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دلی اور سرینگر کے موسم کے بارے میں، اردو زبان اور صحافت کے بارے میں اور عالی بھائی اور ان کی فیملی کے دلی آنے کے بارے میں ــــ ہم نے سرینگر آنے کی دعوت دی۔ جس سے انہوں نے بخوشی قبول کیا۔

وہاں سے نکل کر ہم سیدھے اواری ٹاورس آ گئے۔
شہزاد منظر فوٹو گرافر کو لے کر آئے تھے
انٹرویو مکمل ہو گیا۔

انہوں نے اپنا ناول " اندھیری رات کا تنہا مسافر" دیا اور "ردعمل" کی ایک جلد مظہر امام کے لئے دی۔ فرمان فتح پوری تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی تنقیدی کتاب "تحقیق و تنقید" عنایت کی۔ میں فرمان بھائی کو دروازے پر چھوڑنے گیا۔ سامنے سے ایک بزرگ شخص آتے دکھائی دیے۔ یہ محمد زبیر فاروقی الہ آبادی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب دی۔ "رسالہ عدد لفظ معاون تاریخ" وہ ڈاکٹر نارنگ اور بیدی صاحب سے ملنے کے خواہش مند تھے۔

رات کا ڈنر وزیر اعلیٰ غوث محمد شاہ کی جانب سے تھا۔ اس موقع پر اعلیٰ سرکاری آفیسر، وکلا، پروفیسر، صحافی، آرٹسٹ، سیکرٹری اور ممتاز ادیب اور شاعر جمع تھے۔ ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔ غوث صاحب کچھ وقت تک بیدی صاحب سے محو گفتگو رہے۔ ٹیلی ویژن والے فلم لے رہے تھے۔ روشنیوں کی فراوانی میں ہوٹل کے وسیع ہال میں مردوں اور خواتین کا غیر معمولی اجتماع بہت پُر مغز تھا ــــ باتیں، مزاج پرسی، قہقہے، مسکراہٹ۔ نارنگ صاحب پروین شاکر سے ہمکلام تھے۔ آزاد صاحب خلافِ معمول خاموش سے تھے۔ مسعود صاحب حسبِ عادت ہجوم میں تنہا تھے۔ خلیق انجم مختلف لوگوں سے گرمجوشی سے ملتے رہے۔

میں بیگم ممتاز راشدی سے باتیں کرتا رہا۔ ایک خوبرو، خوش کلام اور ذہین خاتون ڈان کی رپورٹر، اپنی انگریزی دانی کی بنا پر خاصی شہرت یافتہ۔ وہ جان کر خوش ہوئیں کہ میں سرینگر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا پروفیسر اور سربراہ ہوں۔ انہوں نے ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورت حال کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان کئی زبانوں کا ملک ہے۔ آئینِ ہند کی رو سے چودہ زبانیں تسلیم شدہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، ہندی سرکاری زبان ہے لیکن اردو کو یہ امتیاز اور وصف حاصل ہے کہ یہ عوام میں مقبول ہے۔ نیز یہ ملک کے مختلف

لسانی گروہوں اور اکائیوں کے درمیان رابطے کی زبان کا کام کرتی ہے۔ اس کا ادبی سرمایہ بھی دقیع اور وسیع ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ نئی نسلوں میں اردو کا چلن کم ہو رہا ہے۔

بیگم صاحبہ نے ازراہِ خلوص اپنی کتاب "سندھ اور نگاہ قدر شناس" مجھے دی۔ یہ کتاب محترمہ نے اصل میں انگریزی میں لکھی ہے اور متین احمد خان نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔

خالد اطہر اور ان کی مسز سے پھر ملاقات ہوئی اِن سے ہر بار مل کر خوشی ہوئی۔ ان کی مسز نسرین، مریم سے کشمیری زندگی کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ خالد اطہر نے اپنی کتاب "آزادی کے بعد سندھی ادب" تحفتاً دی۔ میں نے کہا کہ میں نے ان کے لئے "ناصر کاظمی کی شاعری" محفوظ رکھی ہے۔ طے یہ پایا کہ وہ دوسرے روز ملنے آئیں گے اور کتاب وصول کریں گے۔

پروین شاکر چپ چاپ کھڑی تھیں۔ سب سے الگ تھلگ، سوچتی ہوئی بڑی خوبصورت آنکھیں اور چہرے کی متین خاموشی اس بات کی غماز ہے کہ وہ شریک انجمن ہونے کے باوجود ذہن کے کسی گوشۂ خلوت میں گم ہیں۔

میں نے ان سے کہا۔

"شاعرات میں مجھے کشور ناہید اور آپ کی شاعری پسند ہے۔ آپ کی "خوشبو" سرینگر بھی پہنچ چکی ہے۔"

وہ صرف مسکرادی، مریم سے پوچھنے لگیں۔

"کیسا لگا یہاں آکر"

"یہاں تو بس اپنا سا ہی ماحول ہے، اپنے ہی جیسے لوگ"

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔

مدعوئین خوشنما دہلیز کو پار کر کے مقابل کے وسیع ہال کے بیچوں بیچ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے، سب سے پہلے مشروبات پیش ہوئے۔ اس کے بعد مختلف اقسام کے کھانے

یکے بعد دیگرے پلیٹوں پر تقسیم ہوتے رہے اور ہر چیز کے بعد پلیٹ بدل دی گئی۔ میری دائیں جانب محکمہ تعلیم کے سیکرٹری صاحب بیٹھے تھے۔ کراچی میں تعلیمی ترقی اور خاص کر عورتوں کی تعلیم کے بارے میں انہوں نے تفصیلات بیان کیں۔ بائیں جانب خلیق انجم تھے۔ وہ طرح طرح کے کھانوں کی داد دے رہے تھے۔

کھانا ڈیڑھ گھنٹہ تک چلتا رہا۔ کھانے کے اختتام پر وزیر اعلیٰ نے اپنی مختصر تقریر میں وفد کا شکریہ ادا کیا۔ اور ہند پاک دوستی کو زیادہ مستحکم کرنے پر زور دیا۔ بیدی صاحب نے وزیر اعلیٰ کا شاندار دعوت دینے پر شکریہ ادا کیا۔ آخر میں اگرو صاحب نے اعلان کیا کہ ملحق کمرے میں اراکین وفد کے اعزاز میں ایک محفل موسیقی کا اہتمام ہے۔ انہوں نے اس محفل میں شرکت کے لیئے دعوت عام دی، کئی حضرات وہاں پہنچ گئے، میرے دائیں بائیں رفیعہ آپا۔ بیدی صاحب۔ جمیل جالبی اور مریم تھیں۔ ہم کافی دیر تک شعر و نغمہ سے محظوظ ہوتے رہے۔ شعر و موسیقی کا یہ پروگرام ریڈیو کراچی کے زیر اہتمام منعقد ہوا اس میں فن کاروں اور خوبصورت گلوکاراؤں نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے

سارا پروگرام سندھی موسیقی پر مبنی تھا کافیاں، گیت اور کورس پیش ہوئے۔

حیدر علی اور مس اینیتا نے جوشیلے انداز میں گانے گائے۔ اکتارہ اور الغوزے کی موسیقی سے سحر کا سماں بندھ گیا۔ حضرت سچل سرمست کی کافیاں دل میں اتر گئیں۔ گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے پوری آزادی اور کھلے دل سے آواز کا جادو جگایا۔ گانوں کی لے عوامی نوعیت کی تھی۔ مگر اس کا TEMPO بہت ہی تیز تھا۔ اس لئے عہد قدیم کا ورثہ ہونے کے باوجود وہ جدید مشینی اور تیز رفتار زندگی کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ لوک گیتوں اور لوک ناچوں کو زندہ رکھنے اور آثار قدیمہ کا حصہ بننے سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے TEMPO کو تیز تر کیا جائے۔ ورنہ بدلتے حالات میں، یہ کشمیری صوفیانہ موسیقی کی

طرح، جو ایک پوری تہذیبی اور فکری زندگی کی نمائندگی کرتی ہے، زوال آمادہ ہوں گے۔

میں اور مریم جمیل جالبی کے ساتھ لفٹ سے اترے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جمیل جالبی ہمارے کمرے میں تشریف لائے۔ میں نے اپنی چند کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں۔

"وائس چانسلری کے باوجود آپ اتنی ضخیم کتابیں کیونکر لکھ پاتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"یہی تو مشکل ہے کہ جب سے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے، لکھنے پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں مل رہا ہے"۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے اور اتنے علم و فضل اور شہرت کے باوجود منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہیں۔ دراز قد، خوشرنگ، خوش گفتار۔ ان کی شخصیت میں غیر محسوس طریقے سے دل میں گھر کرنے کا سحر ہے! ؎

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

جمعرات ۹ جنوری

۹ جنوری کو "بھارت میں اردو ادب" کے موضوع پر سیمنار کے انعقاد کا پروگرام تھا۔ یہ سیمنار ادبیات پاکستان اور نیشنل بک کونسل کے تعاون سے منعقد ہو رہا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ابوالفیض سحر نے ماہنامہ اظہار کا ایک بڑا پیکیٹ دیا۔ یہ پیکیٹ سبھی اراکین کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ایک پیکیٹ پہچان الجمہوریہ اور پاک ہیج کا بھی تھا۔ مریم نے کتابوں اور رسایل کو سنبھال کے رکھا۔ چترویدی نے اطلاع دی کہ سیمنار ایک ہی دن کا ہوگا۔ دو نشستیں ہوں گی۔ اگرو صاحب سے بیدی صاحب نے بات کی تھی اور اگرو صاحب نے صبح سویرے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ انھوں نے وفد کو

موہنجوداڑو ہوائی جہاز سے لے جانے کا پروگرام FINALISE کیا ہے۔ چنانچہ دس جنوری کو موہنجوداڑو جانے کا پروگرام ہے اسی روز شام کو واپسی ہوگی۔ میں نے سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالے کو ایک نظر سے دیکھا میرے مقالے کا عنوان تھا "نئی اردو غزل، ہندوستان میں" مریم آج کے اخبارات کو دیکھ رہی تھیں۔ صبح سویرے رنگین طباعت اور متعدد تصاویر سے آراستہ روزنامہ جنگ بلاشبہ جنتِ نگاہ کا سامان تھا۔

ہم سب ہوٹل کے لاؤنج میں اگروصاحب کے منتظر تھے۔

آغا شاعر قزلباش کے بھائی بیدی صاحب سے ملنے آئے تھے۔

میں مسعود صاحب سے کراچی کی ادبی صورت حال کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ کراچی میں زیادہ تر ایسے ادیب ہیں جو تقسیم سے پہلے ہی ہندوستان میں خاصے معروف تھے۔ وہ اب بھی یہاں کی ادبی فضا پر چھاتے ہوئے ہیں اور ادبی روایات کی توسیع میں مصروف ہیں۔ مسعود صاحب کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا۔ انہوں نے کہا وہ روایتی انداز میں شاعری کرتے ہیں۔ نئی حسیت ان کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"واقعی بقول آپ کے نئی حسیت ان کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"بھائی ہم پر نئی حسیت کیوں لاد رہے ہیں آپ؟ — یہ لیبل تو آپ پر لگا ہوا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن آپ نے دوران گفتگو اس کا اتنی بار استعمال کیا ہے کہ یہ آپ ہی کا ہو کر رہ گیا ہے۔"

آزاد صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے ان کے چہرے پر نقاہت کے آثار تھے۔ کل طبیعت خراب ہوئی تھی۔

مسعود صاحب ابھی تک مزاحیہ موڈ میں تھے۔

"کیوں جناب ضعف سے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔"

آزاد صاحب مسکرائے، مگر مسعود صاحب بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے۔"

"اجازت ہو تو غالب کا شعر تھوڑی ترمیم کے ساتھ پیش کروں"۔

"ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں" آزاد صاحب نے کہا

مفت کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سبھوں نے قہقہہ لگایا۔

قہقہے کی آواز سن کر ربیعہ آپا۔ جو خلیق انجم کے پاس بیٹھی تھیں، اور کراچی کے چند ریسرچ سکالرز سے محو کلام تھیں ہماری پاس آگئیں،

"صاحب وہاں تو سب جدیدیئے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے شکایت کی۔

مسعود صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہاں بھی خیریت نہیں، یہاں بھی تو ایک جدیدیئے بیٹھے ہیں۔

"نہ جائے رفتن نہ جائے ماندن" پھر قہقہہ بلند ہوا۔

بیدی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بیٹھنے سے زیادہ کھڑا ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ آج انہوں نے سفید رنگ کا کُرتہ پاجامہ اور میرون رنگ کی پگڑی اور بغیر بازو کا سویٹر پہنا تھا۔ مریم صوفہ پر سفر نامے کے لئے کچھ نوٹس لے رہی تھیں۔ بیدی صاحب مریم سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹی یہ آپ اپنے شوہر نامدار کے مقالے کی اصلاح فرما رہی ہیں؟"

"مقالے کی ہی نہیں یہ میری بھی اصلاح فرما چکی ہیں اور مسلسل فرما رہی ہیں"۔

میں نے کہا

اتنے میں اگروصاحب پورے طمطراق سے آئے

"چلیئے حضرات چلتے ہیں۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوئے
حامدی صاحب، مبارک ہو آپ کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"
بیدی صاحب نے فوراً فقرہ کسا،
"یہ ان کا ہی نہیں۔ ہمارا مسئلہ بھی تھا۔ اگر ان کی بیگم کے سفر کا مسئلہ حل نہ ہوتا۔
تو حامدی صاحب کا مسئلہ کھڑا ہوتا۔ جو ہم سب کا مسئلہ ہوتا۔"
مسئلہ موہنجوداڑو جانے کے لیے مریم کی ائر ریزرویشن کا تھا۔ اگروا صاحب نے
خصوصی دلچسپی لے کر اس مسئلے کو سلجھا دیا۔
سیمنار کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔
ڈائس پر مسعود حسین خان، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اور میں
تھا۔ کرسی صدارت پر ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ فہمیدہ بیگم نے ہندوستان میں اردو
کی ترقی خاص کر اشاعتی کام کی رفتار پر مقالہ پڑھا۔ دوسرا مقالہ مسعود حسین خان
کا تھا۔ عنوان تھا "اردو میں لغت نویسی کے مسائل" مقالہ بے حد طویل تھا۔ مسعود صاحب
نے غالباً محسوس کر لیا کہ مقالے کی طوالت نے سامعین کے صبر کو نقطہ اختتام پر پہنچایا
ہے۔ اس لیے انہوں نے مقالے کے بقیہ حصے کی تلخیص زبانی پیش کی۔ لیکن جو دراز تر
ہو گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "نیا افسانہ ہندوستان میں" کے عنوان سے
مقالہ پڑھا۔ وہ مقالہ کے بعض حصوں کو وقت کی تنگی کے باعث حذف کرتے رہے۔
نارنگ صاحب نے عمومی بیانات کے بجائے بعض نئے افسانوں مثلاً سلام بن رزاق
کے افسانے کے تجزیہ سے دلچسپی کے عنصر کو قائم رکھا۔ نارنگ صاحب کے بعد میں نے
"نئی اردو غزل ہندوستان میں" پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ سامعین پوری توجہ سے مقالہ
سنتے رہے۔ میں نے مقالے میں نئے شعراء کے مختلف تخلیقی رویوں کا تجزیہ کیا تھا۔ سامعین
کی دلچسپی آخر تک غالباً اس لئے بھی برقرار رہی کیونکہ میں نے نئی غزلوں کے منتخب

اشعار بھی نمونتاً درج کئے تھے۔

صاحب صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں وفد کی آمد پر اظہار مسرت کرنے کے علاوہ پیش کردہ مقالات کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں میں جو پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے ایسے سیمناروں کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا بھارت میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ روح عصر سے لبریز ہے' ——— محسن بھوپالی نے آخر میں صاحب صدر اور شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پہلی نشست کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ڈائس سے اترنے کے بعد بعض حضرات اور خواتین نے مجھے مقالے کے لیے مبارک باد پیش کی۔ ہال کے وسیع برآمدے پر کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ سید علی جعفری نے اپنی کتاب "جام بجام" منظہر یوسف نے سلیم احمد پر مرتب کی ہوئی کتاب "اکائی" اور طاہر آفریدی نے جو پشتو کے مشہور افسانہ نگار ہیں' اردو افسانوں کا مجموعہ دے دیا۔

اس موقعہ پر مختلف ادیبوں سے گفتگو ہوئی۔ آج کی نشست میں سامعین کی کمی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ نشست گاہ شہر سے کافی دور ہونے کی بنا پر اور آفس ٹائم ہونے کی بنا پر زیادہ لوگ نہ آسکے میرے خیال میں ایک وجہ یہ تھی کہ سیمنار کافی تاخیر سے شروع ہوا۔ صاحب صدر یونیورسٹی میں کسی ناگزیر مصروفیت کی بنا پر دیر سے آئے۔ ممکن ہے آج کے سیمنار میں صاحبان ذوق کی شرکت کی کمی کے یہ اسباب رہے ہوں۔ مگر عمومی صورت حال یہ ہے کہ سیمناروں میں سامعین کی تعداد واجبی ہی ہوتی ہے۔ کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام جو کل ہند سیمنار منعقد کئے جاتے ہیں ان میں بھی سامعین کی شرکت کا مسئلہ پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔
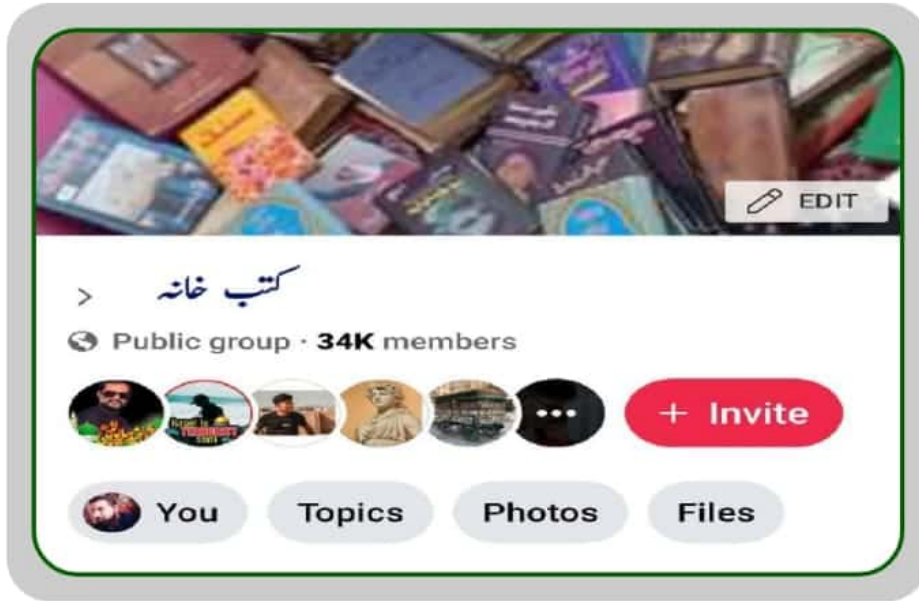
لطف اللہ خان میرے بازو میں کھڑے تھے۔ ادھیڑ عمر کے تندرست و توانا اور فعّال شخص۔ کل سے انہوں نے کئی بار ٹیلی فون کیا تھا۔ تاکہ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ وہ میرے خیالات اور کلام کو صدا بند کرنا چاہتے تھے۔ نارنگ صاحب نے بھی تاکید کی کہ یہ کام ہونا چاہیئے۔ خلیق انجم' آزاد صاحب' بیدی صاحب اور مسعود صاحب پہلے ہی اپنی آواز صدا بند کر چکے تھے۔

"آپ میرے ساتھ تشریف لایئے۔ سیمنار کی دوسری نشست شروع ہونے سے پہلے ہی آپ فارغ ہوں گے۔"

ہم ان کے ساتھ ہو لئے۔ وہ رفیعہ سلطانہ کو بھی لے آئے۔ ان کی رہائش کسموپالٹن کالونی میں سین گپتا روڈ پر واقع ہے۔ انہوں نے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے مشینوں کو درست کیا۔ اس کے بعد ہمارے تاثرات صدا بند کئے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی اور نظریات ادب کے بارے میں اظہار خیال کیا اور غزلوں کے بعض اشعار سنائے۔ رفیعہ سلطانہ نے سفر پاکستان کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کرا لئے۔ مریم نے اردو زبان و ادب سے اپنی وابستگی کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ مریم اپنے خیالات ریکارڈ کروا رہی تھیں اور میں لطف اللہ خان کے نوادر سے معمور کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرہ ایک عجائب خانہ سے کم نہ تھا۔ چاروں طرف ریکارڈنگ کے آلات' لاتعداد کیسٹس' آلات موسیقی' فوٹو گرافی کا سامان' قسم قسم کی منقش چھڑیاں۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی لطف اللہ خان تن تنہا مشینوں کو چلا رہے تھے۔ وہ ہماری آوازوں کو صدا بند کر کے اپنی مسرت کو چھپا نہیں پائے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ سینکڑوں اردو ادیبوں شاعروں اور نقادوں کے خیالات اور شاعری کو محفوظ کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے انہوں نے فیض احمد فیض کا سارے کا سارا کلام صدا بند کر لیا ہے۔ بھارت سے جو شاعر و ادیب کراچی

آتا ہے لطف اللہ اُسے دام لطف میں گرفتار کر کے اپنے سٹیڈیو میں لے جاتے ہیں۔ اور اس کی آواز محفوظ کرتے ہیں۔ تصویریں لینے کے وقت انہوں نے اپنی بیگم کو آواز دی۔

"زاہدہ سنو تو!"

وہ آگئیں۔ انہوں نے محبت سے ہماری مزاج پرسی کی، جیسے وہ ہم سے پہلے سے آشنا تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کیمرہ کے سامان کی درستگی اور لائیٹس آن کرنے میں خاموشی سے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔ زاہدہ نیک با اخلاق اور ذہین خاتون ہیں۔ شوہر کی مددگار، رفیق کار۔ اب خاصا وقت ہو چکا تھا ہمیں واپس لیاقت میموریل لائبریری پہنچنے کی جلدی تھی۔ خاص کر رفیعہ سلطانہ حد درجہ بے چین ہو رہی تھیں۔ اس لیے کہ ان کو دوسری نشست میں مقالہ پڑھنا تھا۔ ہم اجازت لینے لگے مگر بھابی زاہدہ، ہمیں ساتھ والے کمرے میں آنے پر اصرار کرنے لگیں۔

ہم اندر کے کمرے میں گئے

وہاں ڈائننگ ٹیبل پر قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ ہم حیران تھے کہ بھابی نے اتنے کم وقت میں اتنا ڈھیر سارا کھانا کیونکر بنایا۔ اب مجال انکار نہیں تھی۔

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

ہم جلدی جلدی ان کی بنائی ہوئی ضیافتوں کو کھانے لگے۔ سادہ چاول بھی تھے۔ جنہیں ہم نے شوق سے کھایا۔ دیگر پکوانوں یعنی روغن جوش، کوفتے، آب گوشت، مٹر، پالک، قیمہ، مرغ بنا ہوا گوشت، اچار، چٹنی اور سویٹ ڈشز کو ہم صرف چھوتے رہے۔

"آپ نے واقعی تکلف کیا ہے" میں نے کہا

"آپ نے بہت زحمت کی" رفیعہ سلطانہ نے کہا

"نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ آئے ہیں۔ کاش آپ کے پاس فرصت ہوتی"

ان کا سلیقہ اور اہتمام دیدنی تھا

لطف اللہ خان کہہ رہے تھے کہ ان کو صدابندی کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے آج تک اس پر لاکھوں روپے صرف کئے ہیں حالانکہ مکان ابھی تک کرائے کا ہے وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی سے وابستہ ہیں۔

"آپ نے جو کام کیا ہے وہ واقعی آیندہ نسلوں کے لیے ایک قیمتی میراث ہے"

لطف اللہ خان نے بڑی پھرتی سے اپنی کار میں ہمیں واپس جلسہ گاہ میں پہنچا دیا۔ ستر برس کی عمر میں بھی وہ جس محنت لگن اور مستعدی سے کام کر رہے تھے۔ وہ ان کا ہی حصہ ہے سیدھے۔ سچے۔ نیک اور باشعور انسان۔ انہوں نے یہ کہہ کر میری حیرت میں اضافہ کیا کہ اردو ادب کے علاوہ انہوں نے اپنے سٹیڈیو میں دیگر ہائے شعبۂ فکر یعنی موسیقی، مذہبیات سے متعلق ماہرین کے خیالات بھی محفوظ کر لئے ہیں۔ انہوں نے غزلیات غالب کو رومن رسم خط میں منتقل کیا ہے۔

دوسری نشست کا آغاز ہونے والا تھا تین بج چکے تھے۔

اگرو صاحب آئے۔ انہوں نے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے صبح کی نشست میں پڑھے گئے مقالے پر مبارک باد دی۔ لائبریری کی عمارت کے باہر صحن میں خلیق انجم کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طالبات سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جمیل جالبی صاحب آئے۔ انہوں نے کہا "بہت اچھا مقالہ پڑھا آپ نے"

"شکریہ"

اس کے بعد انہوں نے کار کا دروازہ کھلوایا اور کتابوں کا ایک بڑا پیکیٹ پیش

کیا۔

"یہ تاریخ ادب کی جلدیں ہیں اور چند اور کتابیں اور رسایل"

میں سراپا تشکر تھا۔

میں نے مشکل سے کتابوں کے وزنی پیکیٹ کو اٹھایا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس نشست کی صدارت کرنے والے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ چنانچہ صدارت کے لیے جمیل اختر سے گذارش کی گئی وہ ہرگز تیار نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے بھی زور ڈالا کہ وہ کرسی صدارت کو سنبھالیں۔ جمیل اختر سے مل کر خوشی ہوئی۔ دوہرے جسم کے میانہ قد کے، شگفتہ جبیں آدمی، شعبہ اردو جامعہ کراچی کے سربراہ،

"حامدی صاحب میں نے شعبے کا رسالہ آپ کو بھجوا دیا تھا۔ رسید سے محروم رہا۔"

"رسالہ مجھے مل گیا ہے۔ رسید اس لئے نہیں بھیجا کیوں کہ یہاں آنے کی صورت پیدا ہو رہی تھی"۔

انہوں نے معذرت کر لی کہ وہ ہمارے ٹایٹ پروگرام کی وجہ سے شعبہ اردو میں نہ بلا سکے پہلا مقالہ رفیعہ سلطانہ نے پڑھا۔ دکنی ادب کے بارے میں، دوسرا مقالہ جگن ناتھ آزاد نے پڑھا اور تیسرا مقالہ خلیق انجم کا تھا۔

رفیعہ سلطانہ نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے مسعود حسین خان کے اس خیال سے سخت اختلاف کیا کہ حالیہ تحقیق کی رو سے خواجہ بندہ نواز کے معراج العاشقین کے مصنف ہونے کے بارے میں کوئی شک یا اختلاف ہے۔

ہوٹل آکر ہم سستائے۔

نذر الحسن صدیقی اور نسیم آروی نے اپنے افسانوی مجموعے دیئے۔ سلطان جمیل نسیم نے بھی اپنے افسانوں کا مجموعہ "کھویا ہوا آدمی" لیاقت میموریل لائبریری میں

زیبا۔ حمایت علی شاعر سے قدرے تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔

"آپ کو کسوٹی پروگرام میں بارہا دیکھا ہے"۔ مریم نے کہا

حمایت علی شاعر نے اپنی چھ تصانیف عنایت کیں۔

شام کے چھ بجے فاطمہ جناح روڈ پر واقع انڈیا ہاؤس میں ہندوستان کے قونصل جنرل آفتاب سیٹھ کی جانب سے استقبالیہ میں بہت سے ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقات ہوئی۔ آفتاب سیٹھ اور ان کی اہلیہ نیلما سیٹھ مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ استقبالیہ کی تقریب ایک وسیع شامیانے میں ہو رہی تھی۔ مریم، مسز شرما، مسز جین اور دیگر خواتین سے مصروف گفتگو تھیں۔

"ان سے ملئے یہ مسز راؤ ہیں"

خوب صورت ساڑھی میں ملبوس ایک خوبصورت، جوان، خوش اندام اور شگفتہ رو خاتون، وہ کہہ رہی تھیں۔

مجھے راؤ صاحب کے ساتھ ایک دوسری تقریب میں جانا تھا لیکن ہم وہاں نہ گئے"۔

"آپ نے اچھا کیا وہاں نہ گئیں"۔

"کیوں ؟"

"آپ سے ملنے سے محروم ہو جاتے"

انہوں نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا،

ان کے شوہر سے تعارف ہوا۔

اکہرے جسم کے متین اور مخلص انسان، قیمتی سوٹ میں ملبوس مسز راؤ مریم سے شاپنگ کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔

"کہاں کی شاپنگ ؟ یہاں تو پل بھر کی بھی فرصت نہیں"۔

راؤ صاحب نے کہا کہ انہوں نے گلشن اقبال میں راؤ ببیا شرز کے نام سے ایک

اشاعتی ادارہ قایم کیا ہے۔ وہ پوری دنیا میں گھوم چکے ہیں۔ سعودی عربیہ میں ان کا ایک ہوٹل ہے۔ لاکھوں کا بزنس ہے انہوں نے کہا کہ وہ اب اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم ان کے دفتر چلیں۔

میں نے راؤ صاحب اور مسز راؤ کا تعارف نارنگ صاحب سے کرایا۔

قیصر ادیب بھی ملے۔ انہوں نے میرے مقالے کا فوٹوسٹیٹ کروایا تھا۔ قیصر ادیب کراچی کے مشہور صحافی ہیں۔ وہ روزنامہ "مشرق" اور ہفت روزہ "راز داں" سے منسلک ہیں۔ بہت سے ادیبوں سے ملنے کے بعد ہم ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساتھ ان کے دولتکدے کی جانب روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی میں جمیل جالبی، ڈاکٹر نارنگ اور میں، دوسری گاڑی میں مسز جمیل جالبی، رفیعہ سلطانہ، مریم اور فہمیدہ بیگم تھیں۔ راستے میں جمیل جالبی سے گفتگو کا موقع ملا۔ وہ مارچ میں دہلی آنے کے پروگرام کے سلسلے میں نارنگ صاحب سے بات کرتے رہے آج کے سیمنار اور مقالات کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ جمیل جالبی کو کشمیر سے قلبی وابستگی ہے۔ وہ کشمیر کو دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ انہوں نے فخریہ کہا کہ ان کی بہو کشمیری ہے۔ اور ان کی دو بھابیاں بھی کشمیری ہیں۔ وہ کشمیری وازہ وان اور کشمیری چائے کے دلدادہ ہیں۔

ہم ان کی عالیشان کوٹھی میں داخل ہوئے ان کی کوٹھی اداری ٹاورس سے کافی دور واقع ہے۔ ہم راستے میں کراچی کے بہت سے بازاروں سے گزرے۔ یہ شہر واقعی بے حد ترقی یافتہ ہے۔ ہر جانب جدید وضع کے خوب صورت بنگلے، سڑکوں پر کاروں کی ریل پیل اور خوش پوش لوگوں کے ہجوم، کالونیاں، چوک، شاہراہیں، ادارے، دکانیں ___

جمیل جالبی کی کوٹھی بہت کشادہ اور خوب صورت ہے۔ ڈرائنگ روم قیمتی صوفوں سے آراستہ۔ سامنے کی دیوار پر جمیل جالبی کا بڑے سایز کا اسکیچ۔ سیمنار میں آج کی نشست میں معراج العاشقین کے مصنف کے بارے میں جو نئی تحقیق ہوئی ہے۔ اس کے بارے

میں مسعود حسین خان کے خیال اور رفیعہ سلطانہ کی جانب سے اس کی پرزور تردید کا موضوع زیر بحث رہا۔

"رفیعہ آپا تو ہاتھ دھوکر مسعود صاحب کے پیچھے پڑگئیں"۔ نارنگ صاحب نے کہا۔ قہقہہ!

"مسعود صاحب نے انڈیا ہاؤس کے استقبالیہ میں کہا کہ رفیعہ سلطانہ تازہ تحقیق سے آشنا نہیں" ــ میں نے کہا۔ رفیعہ سلطانہ بہت سنجیدگی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے لگیں۔

جمیل جالبی کی بیٹی فرح چائے لے کر آئی ــ پیاری، لمبی اور دبلی پتلی، بالکل صبا جیسی۔ صبا بیٹی کی یاد نے دل کو تڑپایا ــ مریم نے فرح کو پیار کیا اور کہا،

"ہماری بیٹی صبا جیسی ہے، ماشاءاللہ!"

"سنیئے، بھائی، ایک عورت مساوی ہے دس عورتوں کے" جمیل جالبی بولے،

"اس حساب سے اس وقت کمرے میں چالیس عورتیں ہیں اور مرد صرف تین

مریم نے کہا، سب نے قہقہہ لگایا۔

"عورت کا کیا کہنا" وہ بولے۔ "مرد کو جنت سے نکلوایا۔ لیکن گھر کو جنت بنایا۔"

"آپ اپنے حوالے سے کہہ رہے ہیں" میں نے کہا۔

"جی ہاں، میرے کام میں صرف میری بیوی کا ہاتھ ہے۔ وہ یوں کہ وہ بے حد کم گو ہیں۔"

آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ مولیئر کا وہ ڈرامہ آپ نے پڑھا ہوگا۔"؟

"کون؟"

میں نے اس ڈرامے کا ذکر کیا۔ جس میں شوہر کا مسئلہ یہ ہے کہ بیوی گونگی ہے وہ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کی قوت گویائی بحال ہوتی ہے۔ تو وہ چوبیس گھنٹے بولنے لگتی ہے۔ وہ پھر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور بیوی کی بسیار گوئی کی

شکایت کرتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کی زبان اب بند ہونے سے رہی، پھر کیا ہوگا؟
شوہر بے بسی سے پوچھتا ہے۔
آپ بہرہ ہو جایئے۔ میں آپ کو بہرہ کر سکتا ہوں؟
سب ہنستے ہیں۔
مسز جالبی آتی ہیں وہ نجابت، خوش خلقی اور شفقت کی تجسیم ہیں۔ کہتی ہیں—
"آیئے کھانا تیار ہے۔"

ہم حیران ہیں کہ بھابی نے اتنے لوگوں کے لئے صرف چند منٹوں میں کھانا کیونکر بنایا اور پھر کھانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا۔ ہم نے یک زبان ہو کر معذرت کی، لیکن ان کے سامنے ایک نہ چلی۔

ڈائننگ ٹیبل انواع و اقسام کے پکوانوں سے آراستہ تھا۔

کھانا کھا کر ہم نے بھابی کا شکریہ ادا کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر فرد نے کھانا نہ کھانے کے موڈ میں ہو کر بھی خوب کھایا شاید اس لئے کہ گھر کے کھانے کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

ہم جمیل جالبی کی لائبریری کو تعجب سے دیکھتے رہے۔ ایک کشادہ کمرہ جس میں چاروں طرف سے فرش سے چھت تک الماریوں میں سجی سجائی کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ اور دیوار کے ساتھ ایک بڑے ٹیبل پر کتابوں اور مسودوں کے انبار۔ اسی ٹیبل پر جمیل جالبی تنقید و تحقیق کے معرکے سر کرتے ہیں۔

## جمعہ ۱۰ جنوری

آج موہنجوڈارو جانے کا پروگرام تھا — ۵ بجے صبح تیار ہو کر اور ناشتہ کر کے نیچے لاؤنج میں جمع ہوئے۔ چہروں پر تکان اور بے خوابی کے آثار تھے۔ فہمیدہ بیگم اور رفیعہ سلطانہ نے حسب معمول دیر کر دی۔ جیتندر ویدی دونوں خواتین کو دوبارہ بلانے گئے۔ وہ آگئیں تو

بیدی صاحب نے کہا۔

آئندہ جو شخص دیر کرے گا۔ اُسے سب کے کپڑے دھونے ہوں گے۔"

خواتین خاموش تھیں، لیکن دوسرے حضرات نے قہقہہ لگایا۔

جہاز پرواز کرنے لگا، میری ساتھ والی نشست پر نارنگ صاحب بیٹھے تھے ایئرہوسٹس نے آج کے اخبارات تقسیم کئے۔ مشرق میں آل احمد سرور کا انٹرویو چھپ چکا تھا۔ انٹرویو میں ترقی پسند تحریک کے بارے میں آل احمد سرور نے گول مول باتیں کی تھیں۔

"ایسا لگتا ہے کہ ان کا رویّہ مفاہمت آمیز ہے"۔

نارنگ صاحب نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ میری طبیعت کچھ خراب ہونے لگی، متلی کا سا احساس ہونے لگا، میں نے AVOMIN کی گولی کھائی، اتنے میں اعلان ہوا،

"افسوس ہے کہ جہاز لینڈ نہیں کرسکتا کہر چھایا ہوا ہے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے ـــــ اس لئے واپس کراچی ایئرپورٹ جاتے ہیں"۔

طبیعت کی گرانی اور بے چینی میں ہوائی جہاز کی واپسی اور گراں گزری۔

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے

کراچی میں جہاز سے اتر کر تازہ اور کھلی فضا میں طبیعت قدرے بحال ہوئی۔ لاؤنج میں، میں صوفہ پر اونگھتا رہا۔ ابوالفیض سحر آئے۔ انہوں نے مزاج پُرسی کی۔ اتنے میں روانگی کا دوبارہ اعلان ہوا ـــــ

جہاز پھر کراچی کے شہر کے اوپر سے پرواز کرنے لگا، ہلکی سی دھوپ میں سارا شہر بیدار ہو رہا تھا۔

نارنگ صاحب نے راہداری سے آکر کہا:

"کیبن میں کیپٹن آپ کو بلاتے ہیں"۔

میں کیبن میں گیا۔ وہاں دو جواں سال کیپٹن اور کوکیپٹن بیٹھے تھے۔ درمیان میں جہاز کا انجن، مشینری کا پیچیدہ نظام، دونوں محبت سے ملے یہ سن کر کہ میں کشمیر سے آیا ہوں۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے وادی سندھ کی جانب اشارہ کیا۔ حد نظر تک ریگستان ہی ریگستان !

موہنجوڈارو میں ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لئے ڈی سی رشید عباسی اور سٹی مجسٹریٹ موجود تھے۔ ایک جوان، ذہین، خوش مزاج اور زندہ دل آدمی قمیض، شلوار، اور واسکٹ میں ملبوس، ریسٹ ہاؤس میں بہت ہی پرتکلف ناشتے سے ہماری تواضع کی گئی۔

موہنجوڈارو کے کھنڈرات ہمارے سامنے تھے۔

پانچ ہزار سال قبل کے زمانے کے تہذیبی نقوش — یہ کھنڈرات کراچی سے ۲۵۰ میل کی مسافت پر وادیٔ سندھ میں واقع ہیں اور قدیم ترین انسانی بستی کے آثار ہیں، ہم اس قدیم ترین شہر کو حد درجہ اشتیاق سے دیکھتے رہے۔ گائیڈ سمجھاتا رہا۔ عمارتوں، دیواروں، عبادت گاہوں اور گلی کوچوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاہی خاندان کا علاقہ ہوگا۔ محلات کے بیچوں بیچ سڑکیں بنی ہیں۔ دیواریں پکی اینٹوں کی ہیں اور مکانوں اور رہائش گاہوں کا ایک طویل سلسلہ ہے سڑکوں اور کوچوں کے ساتھ اینٹوں کی بنی ہوئی نالیاں ہیں۔ عمارت کے بیچوں بیچ ایک بڑا تالاب ہے جو غالباً مذہبی رسوم کی ادائیگی کے کام آتا تھا۔ ملحقہ مکانوں میں پیشوا یا افسر اعلیٰ رہتے ہوں گے۔ ایک کانفرنس ہال ہے۔ سارا علاقہ اونچے ٹیلوں پر آباد ہے۔ مکانات یک منزلہ بھی ہیں۔ اور دو منزلہ بھی۔ مکانوں کے ساتھ غسلخانے بھی ہیں اور ڈرینیج سسٹم بھی ہے پانی کے لئے کنویں استعمال ہوتے تھے چنانچہ کھدائی سے ۸۰ کنویں نکلے ہیں۔ موجودہ صدی میں جان مارشل نے ۱۹۲۲ء میں اس شہر کو دریافت کیا ہے۔

گائیڈ نے بتایا کہ موہنجوڈارو کا مطلب ہے مرے ہوؤں کا ٹیلہ، قرینِ قیاس ہے۔ پندرہویں صدی قبل مسیح میں آریہ حملہ آوروں نے اسے غارت کردیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ سیلاب نے اس شہر کو غرقاب کردیا ہے ——

دھوپ تیز ہو گئی،

ہمارے ساتھ ڈی، سی، کے علاوہ ان کے اسسٹنٹ سید محمد حسین ایک سندھی سکالر اور شاعر ڈاکٹر عبدالمجید میمن پرنسپل کامرس کالج چانڈیو۔ عبدالمنان پرنسپل سیمل کالج لاڑکانہ پروفیسر محسن چیا اور گورنمنٹ مغل ہائی سکول کی سائینس اور ریاضی کی استانیاں پروین مغل اور ساجدہ نسرین تھیں۔

ہم نے رلیسٹ ہاؤس کے ساتھ ہی عجائب گھر کا معائینہ کیا۔

دوسری منزل پر ایک کشادہ اور لمبا کمرہ ہے جس میں دیواروں کے ساتھ شیشے کی الماریاں میں موہنجوڈارو کی تہذیب سے متعلق نوادر محفوظ ہیں۔ اجناس رکھنے کے مٹکے، سکے مہریں، ترازو، مالائیں اور پتھر کی مورتیاں۔ اتنے میں مریم نے متردد لہجے میں کہا کہ رفیعہ آپا کا سونے کا ہار کھو گیا ہے۔ یہ خبر فہمیدہ بیگم نے دی، مریم کا خیال تھا کہ اس کی خبر کسی کو نہیں کرنا چاہیئے تاکہ میزبانوں کو بلاوجہ پریشانی نہ ہو۔ نارنگ صاحب نے سنا، وہ بھی بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے بھی خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ "ہار ڈھونڈنے میں لڑکیاں ہی مدد کر سکتی ہیں"۔

"سونے کا ہار یہاں پہننے کی کیا ضرورت تھی؟" مریم نے کہا۔

"ہاں یہ صحیح ہے، فہمیدہ بیگم نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پرس میں رکھ دیا۔ ہم میوزیم سے باہر آئے۔

اتنے میں سامنے سے پروین اور ساجدہ نظر آئیں اور پھر رفیعہ آپا —— تینوں کے چہرے کھِل اٹھے تھے۔ ہار مل گیا تھا۔ سڑک پر مٹی میں پڑا ہوا تھا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

ڈائننگ ٹیبل پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ مرغ اور گوشت کے مختلف پکوان کے ساتھ کئی مقامی چیزیں مثلاً مکھن، شہد، ساگ، ندرو اور جوار کی روٹی اشتہا انگیز تھیں مجھے خاص کر جوار کی گرم گرم روٹی اور خالص شہد بے حد پسند آیا۔ کھانا وافر تھا اور بے حد لذیذ۔

لنچ کے بعد باہر خوشگوار دھوپ میں سبزے پر صوفوں اور کرسیوں پر سبھی اراکین و معززین بیٹھ گئے اور سندھی لوک ناچ کا دلچسپ پروگرام پیش ہوا۔ یہ ناچ سندھ کے مشہور رقاص پیش کرتے رہے۔ رقاصوں کی اس ٹولی میں دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ جھمر رقص بہت خوب تھا۔ رقاص مقامی لباس میں ایک بڑے دائرے میں پھیل جاتے ہیں اور ڈھول بجانے والوں کی آواز پر رقص کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔

"یہ رقص یہاں کا ہر فرد کرسکتا ہے۔ شادی کی تقریب پر لڑکے اور لڑکیاں مل کر یہ رقص کرتی ہیں" پروین نے کہا ـــــ "لوک ناچ کی کئی قسمیں ہیں، جمالو ناچ، مکرانی گنگرو ناچ" ـــــ رقص و نغمہ کا یہ پروگرام ضیافت روح کا سامان تھا۔

مسعود صاحب بھی میری طرح لنچ کے اثر کو زائل نہیں کرپائے ـــ وہ بیچ بیچ میں جھپکی لیتے، خلیق انجم نیند سے مغلوب ہوکر ریسٹ ہاؤس کے اندر گئے۔

ڈی سی صاحب نے اپنی تقریر میں جذبات مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے اراکین کو اجرک تحفتاً پیش کیے۔

ہم سڑک کے پار دکان میں گئے اور مقامی چیزوں میں ہم نے ایک ڈیکوریشن پیس خرید لیا۔

ڈی سی نے ہمیں ائرپورٹ پر رخصت کیا۔ کراچی کا جگمگاتا ہوا شہر نزدیک آرہا تھا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ میرے بائیں بازو میں زور کا درد ہو رہا ہے۔ بازو کے

اوپری حصے میں جہاں روانگی سے ایک روز قبل دہلی میں انٹی کالرا انجکشن لگوایا تھا۔
ہوٹل پہنچ کر میں لیٹ گیا۔ میرے بازو کے درد سے مریم بھی پریشان ہوئیں۔ وہ اصرار بھی کرتی رہی کہ ٹیلی فون سے ڈاکٹر شاہد علی کو خبر کی جائے معاً مجھے یاد آیا کہ میرے بھائی غلام محی الدین نے سرینگر سے روانگی کے وقت ادویات کا ایک پیکٹ دیا تھا۔ اس میں PAIN کو رفع کرنے کی گولیاں بھی تھیں۔ میں نے ایک گولی کھائی۔ ساتھ ہی میں نے ڈاکٹر سے بھی رابطہ قایم کیا۔ انہوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ جو گولی میں نے کھائی تھی۔ اُس سے درد رفع ہو گا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا کہ محسن بھوپالی آ گئے۔ انہوں نے ناصر کاظمی والی کتاب طلب کی، میں نے ان کو کتاب دی انہوں نے ازراہ شفقت اپنا مجموعہ کلام "ماجرا" دیا۔ تھوڑی دیر لیٹنے سے میرا درد کم ہوا۔ اتنے میں جمیل جالبی اور فرمان فتح پوری تشریف لائے، ان کے ساتھ اختر فیروز تھے۔ جو مہران رائٹرس کلچرل گلڈ اور پاک و ہند لٹریری اکاڈمی کے سیکرٹری ہیں۔

فرمان صاحب نے فوٹو گرافر کو ہماری تصویریں لینے کی ہدایت کی،

اختر فیروز نے پوچھا،

"آپ کہاں سے آئے ہیں۔"

"سرینگر سے"

"واہ، آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں! انہوں نے بے ساختہ کہا،

مشاعرے کا وقت ہو رہا تھا

ہوٹل کے گراونڈ فلور پر خورشید ہال میں ایک پنڈال سجایا گیا تھا۔ اسی ہال میں دائیں جانب ہم نے رات کا کھانا کھایا، پنڈال پر محسن بھوپالی کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر نارنگ اور بیدی صاحب فروکش تھے ــــــ

مشاعرے میں مہمانوں میں سے بیدی صاحب، آزاد صاحب اور میں نے اپنا کلام سنایا۔ مقامی شعرا میں امید فاضلی، شان الحق حقی، حمایت علی شاعر، عالمتاب تشنہ، پروین شاکر، فاطمہ حسن، تابش دہلوی، جمال احسانی، محسن بھوپالی، جاوید صبا، عزم بہزاد، جمیل سراج، پیرزادہ قاسم، اور شبنم رومانی نے مشاعرے میں شرکت کی۔
مشاعرے کے دوران بیدی صاحب کے برجستہ فقروں سے قہقہے بلند ہوئے۔
محسن بھوپالی کی غزل میں بیعانہ کا قافیہ بھی بندھا ہوا تھا۔ بیدی صاحب نے کہا۔

"کیا خوب کاروباری غزل ہے۔" قہقہہ!
شان الحق حقی اپنی جگہ سے اٹھے، تو بیدی صاحب نے فقرہ کسا، آیئے صاحب، مردانے میں آیئے" اس پر قہقہہ بلند ہوا۔
میں مائیک کے سامنے آیا تو بیدی صاحب نے کہا،
"حامدی صاحب عاشقانہ غزل نہیں سنا سکتے، اس لئے کہ ان کی بیگم صفِ سامعین میں بیٹھی ہیں۔"

قہقہہ!!
سنیچروار، ۱۱ جنوری
جنگ گروپ آف نیوز پیپرز کے دفتر میں جنگ فورم کے زیر اہتمام بھارت میں اردو ادب" کے مذاکرے کا پروگرام تھا۔ جنگ کمپلکس کے باہر برآمدے پر جنگ کے چیئرمین و مدیر میر خلیل الرحمان نے وفد کا استقبال کیا، دراز قد، خوبرو، متین، چہرے کے خدوخال کشمیریوں جیسے۔ بیدی صاحب نے فرداً فرداً سب کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"حامدی کاشمیری صاحب سرینگر سے آئے ہیں۔"

آپ کشمیری ہیں، خوب، میں بھی کشمیری ہوں، آپ سے پھر بات کرونگا۔"
وہ بیحد عجلت میں تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسلام آباد روانہ ہو رہے تھے۔
ہم لائبریری ہال میں ایک بڑے ٹیبل کے گرد بیٹھے ٹیبل کے مقابل میں پاکستان
کے ادیبوں کی نمائندگی مشفق خواجہ، شوکت صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ہاجرہ مسرور
اور محمد علی صدیقی کر رہے تھے۔ پاکستانی ادیبوں کے ساتھ جنگ سے وابستہ مدیران
خالد اطہر اور شفیع عقیل بھی موجود تھے۔ اگر دصاحب اور شرماجی بھی تشریف فرما
تھے۔ دیگر حضرات میں عبدالواحد یزدانی اور شمس حنفی بھی تھے۔
میر خلیل الرحمان نے وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا
انہوں نے کہا کہ اس وقت دونوں ہمسایہ ملکوں کے درمیان ہر سطح پر تعلقات کو خوشگوار
اور مستحکم بنانے کی جدوجہد بیراہم جاری ہے۔ انہوں نے کہا۔ آج کا دن جنگ کی تاریخ
کا ایک اہم دن ہے۔ کہ آپ جیسے بڑے ادیب شاعر، دانشور اور محقق یہاں تشریف
لائے ہیں اور پاکستان کے نمائندہ ادیبوں کیساتھ اردو ادب کے بارے میں تبادلہ
خیال کر رہے ہیں۔
انہوں نے جنگ گروپ کے مختلف اخبارات اور جرائد کی تفصیلات بتاتے
ہوئے کہا "جنگ" اردو کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ اور اسکی مجموعی اشاعت ساڑھے
چھ لاکھ ہے۔ ہفت روزہ "اخبار جہاں" ایک لاکھ ساٹھ ہزار چھپتا ہے۔ اس کے علاوہ
انگریزی ہفت روزہ جنگ اور روزنامہ ڈیلی نیوز بھی نکلتا ہے۔" اپنی مختصر سی تقریر
کے بعد میر صاحب رخصت ہو گئے اور مذاکرات کا آغاز شفیع عقیل نے یہ کہہ کر
کیا "یہاں بات چیت اردو ادب اور زبان کے حوالے سے ہو گی"۔
مشفق خواجہ نے کہا:
"بھارت میں تحقیق کا معیار بلند نہیں ہے۔ وہاں ڈگریوں کی خاطر معیار کو نظر انداز

کیا جاتا ہے۔ نقالی اور سرقہ بھی عام ہے۔ چنانچہ داغ اور اصغر گونڈوی پر جوڈگریاں دی گئی ہیں۔ وہ سراسر سرقہ ہیں۔" ڈاکٹر خلیق انجم نے جواب دیتے ہوئے کہا اچھے اور معیاری کام کے ساتھ خراب۔ اور غیر معیاری کام بھی ہوتا ہے جو مثالیں دی گئیں۔ وہ مستثنیات میں سے ہیں۔ تحقیق ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نارنگ صاحب نے کہا' ہمارے یہاں زیادہ معیاری کام یونیورسٹیوں سے باہر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے امتیاز علی عرشی قاضی عبدالودود اور مالک رام کا ذکر کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاعری کے حوالے سے جدیدیت کے زیر اثر علامتی شاعری' نثری نظم اور آزاد غزل کا ذکر کیا اور دریافت کیا کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔

میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہر دور میں حقیقی شعراء کے ساتھ ایسے شعراء کی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ جو نقالی سے کام لیتے ہیں۔ تو یہ ایسی چیز نہیں جسے آپ آج ہی کے دور سے مختص کریں۔ عمومی طور پر جو شاعری جدیدیت کے تحت ہو رہی ہے۔ وہ ایک نئے تخلیقی مزاج اور آہنگ کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری میں علامت کاری من مانے طریقے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تجربے کی خاصیت ہوتی ہے میں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ نئے شاعر کے یہاں نئے دور کی آگہی اور کرب آگہی کا موثر اظہار ملتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا" ہمارے یہاں آزاد غزل کے قدم جمے نہیں ہیں۔ نثری نظم کی ترکیب ناقابل فہم ہے۔ نظم نظم ہوتی ہے اور نثر نثر۔ نارنگ صاحب نے نثری نظم کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ نثری نظم میں اگر صلابت فکر اور شعریت ہو تو وہ زندہ رہے گی آزاد نظم بھی انگریزی سے لی گئی ہے مگر اسے رد نہیں کیا جا سکا۔

شوکت صدیقی اور ہاجرہ مسرور نے جدید افسانے کی مقبولیت' اس کے ترسیلی کردار اور اس کی علامت نگاری کے بارے میں سوالات کیئے۔ ڈاکٹر نارنگ نے

جواباً کہا "علم کہیں سے بھی ملے اسے قبول کرنا چاہیئے کرب ذات کا اظہار جدید فنکار کا مقدر ہے اس کے نزدیک تصور حقیقت میں تبدیلی آئی ہے"۔

فہمیدہ بیگم نے کہا "افسانے سے متعلق کتابیں کافی تعداد میں چھپتی ہیں"۔ خلیق انجم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت افسانوی مجموعے زیادہ نہیں چھپتے اور نہ ہی بکتے ہیں۔ نئے شاعر اور نئے افسانہ نگار اپنے لئے لکھتے ہیں ان کی تخلیقات کو کوئی نہیں پڑھتا۔

محمد علی صدیقی نے جدید تنقید کی صورت حال کے بارے میں استفسار کیا کہ چونکہ ادبی تصورات مغرب سے لئے جاتے ہیں۔ اس لئے تنقیدی معیارات بھی مغرب ہی سے آتے ہیں۔ میں نے اور نارنگ صاحب نے اس سوال کے جواب میں اس بات پر زور دیا کہ ادب کا ایک آفاقی کردار ہوتا ہے۔ اس لئے عالمی تنقید کے اصولوں سے استفادے کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

شوکت صدیقی کے اس سوال کو موجودہ افسانہ نگار دیہاتی زندگی سے زیادہ شہری زندگی کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں۔ جبکہ دیہاتی زندگی کے مسائل زیادہ سنگین ہیں۔ کے جواب میں مسعود حسین خان نے کہا تقسیم کے بعد اردو سمٹ کر چند قصبوں اداروں یا چند دانشکدوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نتیجے میں اردو ادیبوں کا تخاطب عوام سے نہیں رہا ہے۔ بیدی صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "اب اردو کسمپرسی کے عالم میں نہیں ہے اردو کی ترقی و ترویج کے لئے اردو اکاڈمیاں اور ترقی اردو بیورو کام کر رہا ہے"۔

آخر میں خالد اطہر نے پوچھا کہ کیا بھارت میں پاکستان اکاڈمی آف لیٹرز کی طرح کا کوئی ادارہ ہے جسکے زیر اہتمام مختلف زبانوں کے ادیبوں کے اجتماع کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بیدی صاحب نے کہا ترقی اردو بورڈ یہ کام انجام دے رہا ہے۔ خلیق انجم

نے کہا کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو مختلف زبانوں کے ادیبوں کے اجتماعات کا انعقاد کرے ڈاکٹر نارنگ نے کہا یہ کام ساہتیہ اکاڈمی بطریق احسن انجام دے رہی ہے۔

مذاکرے کے اختتام پر شفیع عقیل نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گروپ فوٹوز لئے گئے اور چائے سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔

مشفق خواجہ سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں گلے ملے انہوں نے کہا۔ "حامدی صاحب، میں یہاں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں"۔ "محبت ہے آپ کی" میں ان کے خلوص فراواں سے بیحد متاثر ہوا۔ مشفق خواجہ کے خد و خال کشمیریوں جیسے ہیں عینک کے پیچھے ان کی روشن، ذہین اور معصوم آنکھیں ان کی دلپذیر شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔

جنگ فورم سے نکل کر ہم اردو کالج کراچی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر پہنچے، انجمن کے ناظم اعزازی نورالحسن جعفری، جمیل الدین عالی (جنرل سیکرٹری) اور دیگر اراکین انجمن نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزار پر ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ اس کے بعد ہم عمارت کی دوسری منزل میں گئے، جہاں لائبریری ہال میں پر تکلف چائے پیش کی گئی۔ جعفری صاحب نے خیر مقدمی تقریر میں کہا۔ تقسیم کے بعد سے انجمن نے دو سو کتابیں شائع کی ہیں انہوں نے کہا "ہم ہندوستانی انجمن ترقی اردو سے کتابیں تبادلے میں خریدنا چاہتے ہیں اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے۔ تو بہت ہی مفید ہوگی۔ انہوں نے کہا" انجمن کی جانب سے ماہنامہ قومی زبان پابندی سے شائع ہوتا ہے۔"

عالی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔

" بھارتی وفد کے آنے سے دونوں ملکوں میں ادب کی سطح پر دوستی کی ابتدا

ہوئی ہے۔ جو بہت خوش آیند ہے۔ انہوں نے کہا کہ انجمن اردو سائینس کا نج بھی چلاتی ہے۔

بیدی صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

ہم نے انجمن کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھا ہم سے کہا گیا کہ اپنی پسند کی کتابیں منتخب کریں۔ میں نے چند کتابیں منتخب کرلیں۔ مریم نے کتابوں کے انتخاب میں میری مدد کی انہوں نے انور سدید کی کتاب اردو ادب کی تحریکیں بالخصوص پسند کی۔ اراکین نے کاغذ کے پرزوں پر اپنی اپنی پسند کی کتابیں لکھ دیں۔

ادا جعفری سے ملاقات ہوئی

میں نے کہا آپ کا مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" برسوں پہلے نظر سے گزرا ہے۔ اس کے بعد آپ کا کوئی مجموعہ دیکھنے کو نہ ملا۔ انہوں نے مشفقانہ لہجے میں کہا کہ وہ دیگر مجموعے پیش کرینگی۔ ڈھلتی عمر کے باوجود ان کے چہرے کے خدوخال اور رنگت میں شادابی ہے۔

قومی زبان کے کئی شمارے تحفتاً دیئے گئے خاص کر وہ شمارہ مجھے دیا گیا جس میں ۱۹۸۵ میں دہلی میں منعقدہ اردو افسانے کے سیمنار میں جمیل الدین عالی اور کشور ناہید کے ساتھ میری تصویریں چھپی تھیں۔ دل خوش ہوا۔

لنچ کا اہتمام دلن کے ایک بجے ٹاور انٹرنیشنل ریسٹورنٹ شاہین کمپلکس ایم۔ آر کیانی روڈ پر انجمن ترقی اردو نے کیا تھا۔

ہم لفٹ سے اوپر کی منزل پر جا رہے تھے تو بیدی صاحب نے مجھ سے کہا۔ "آپ تو چھپے رستم نکلے" جنگ کمپلکس میں میرے اظہار خیال کی جانب اشارہ تھا۔

"آپ کی محبت ہے" بیدی صاحب کی کشادہ دلی اور شریف النفسی نے دل پر انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں

ہم ہوٹل کے ٹاپ فلور پر ایک گھومتے ڈائرے کی ہال میں پہنچ گئے چاروں طرف کراچی کا شفاف اور جدید شہر نظر آرہا تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ دائرے کی شکل میں ٹیبل اور کرسیاں لگی تھیں۔ وہ غیر محسوس طریقے سے گھوم رہا تھا۔ بیگم عالی نے کہا کہ ہال ۴۵ منٹ میں اپنا راؤنڈ مکمل کرتا ہے۔ ہمارے ٹیبل پر اگرو صاحب، بیگم عالی مسعود حسین خان نوری پریس کے مالک نوری صاحب اور مریم بیٹھی تھیں۔ میں اور مریم ہال میں داخل ہوئے تو بیگم عالی نے آواز دی۔

"مریم یہاں آؤ" مریم ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ سوپ سرو کیا گیا۔

ویٹر نے مجھے اطلاع دی کہ نیچے مینیجر کے کمرے میں میرا ٹیلیفون ہے۔ میں نے سیڑھی سے اتر کر کمرے میں ٹیلیفون اٹھایا۔ یہ راؤ صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کار بھیج دیں گے تاکہ ہم ان کے ساتھ شاپنگ کریں۔ میں نے نارنگ صاحب کو اطلاع دی انہوں نے ٹیلیفون پر ہی راؤ صاحب سے وقت اور مقام طے کیا میں اوپر گیا تو جس جگہ میرا ٹیبل تھا۔ وہاں کوئی اور ٹیبل آگیا تھا اور دوسرے لوگ اس پر بیٹھے تھے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو تھامی دوری پر مریم نظر آئیں جو ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھیں ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

لنچ بہت پر تکلف تھا۔ بیگم عالی نے مریم کو تحائف دیئے۔

لنچ کے بعد ہم قادر خان کی گاڑی میں بیٹھے اور زینب مارکیٹ گئے۔ وہاں مسٹر راؤ صاحب اور یاسمین ملے ان کی گاڑی میں مریم اور فہمیدہ بیگم بیٹھیں اور مسٹر راؤ ہماری گاڑی میں بیٹھے۔ مسٹر راؤ نے ہمیں پورا مارکیٹ گھمایا۔ خواتین نے کچھ شاپنگ کی۔

۳ بجے ترقی اردو ڈکشنری بورڈ کی جانب سے گلشن اقبال نیپا چورنگی میں عصرانے

کا اہتمام تھا۔ ادب دوستوں اور ادیبوں کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ پر تکلف عصرانے کے بعد ایک وسیع شامیانے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مائیک پر انتہائی پرجوش لہجے میں وفد کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے کہا آج کا دن تاریخی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بھارتی ادیبوں کے دورے سے دونوں ملکوں کے درمیان محبت کے رشتے زیادہ استوار ہو رہے ہیں۔ فرمان صاحب نے فرداً فرداً سب کا تعارف کروا کے سب سے گزارش کی کہ وہ اپنے اپنے شعبۂ فکر کے بارے میں مختصر اظہار خیال کریں۔ بیدی صاحب نے کہا کہ "بھارت میں ادب اردو کا مستقبل درخشاں ہے اردو کو بہار میں دوسری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اردو ہی دونوں ملکوں کے تعلقات کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے کہا۔ "بیورو ۱۲ جلدوں پر مشتمل اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کر چکا ہے"۔

رفیعہ سلطانہ نے کہا۔ "دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں کے تبادلے کی اہم ضرورت کی طرف توجہ کرنا چاہیے"۔

میں نے اپنی تقریر میں اردو کے تنقیدی ادب سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ پہلے سے طے کردہ تنقیدی نظریات سے ادب کی تعین قدر ممکن نہیں اعلیٰ پایہ کی تخلیقات اپنے اندر ایک دریافت طلب تنقیدی نظام رکھتی ہیں۔

خلیق انجم نے کہا۔ "عبدالحق نے جو پودا لگایا تھا وہ اب دونوں ملکوں میں تناور درخت بن چکا ہے انہوں نے کہا بھارت میں انجمن کی ۶۲۱ شاخیں ہیں"

مسعود حسین خان نے کہا کہ کسی زبان کے استحکام کے لئے ایک معیاری لغت بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ اردو کے بارے میں اب یک لسانی تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں یہ کسی علاقے یا فرقے کی زبان نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو جہاں بولی جاتی ہے وہی اس کا مرکز ہے۔

آخر میں ڈکشنری بورڈ کے صدر محمد اظفر صاحب نے وفد اور حاضرین کی تشریف آوری کے لیے پر زور شکریہ ادا کیا۔

اس اجتماع میں کئی اردو اساتذہ، صحافی اور قلم کاروں سے ملاقات ہوئی، بیگم فرمان فتح پوری بڑی محبت سے ملیں۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ مصروفیت کی بنا پر وہ ہمیں گھر نہ بلا سکیں۔ مریم کی دوستی بادشاہ بیگم، مس عائشہ اور فہمیدہ عتیق سے ہوئی۔

راؤ صاحب اور ان کی بیگم ہمیں اپنے دفتر لے گئے۔

ان کا دفتر سلیم سنٹر، گلشن اقبال میں راؤ پبلشرز کے نام سے واقع ہے۔ دونوں میاں بیوی اخلاق و محبت سے، ہمیں دفتر کے کمروں میں لے گئے، صاف وشفاف کمرے، قیمتی سامان سے مزین، ہم راؤ صاحب کے کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد مسز راؤ کے کمرے میں گئے۔ راؤ صاحب نے کہا،

"یاسمین کو میں نے دفتر میں اپنی ماتحتی میں رکھا ہے۔"

"لیکن گھر میں تو ان ہی کی حکمرانی ہوگی۔" میں نے کہا،

راؤ صاحب کے کمرے میں ہم نے لذیذ چائے پی لی۔

قیصر ادیب اور سب رنگ ڈائجسٹ کے مدیر سے ملاقات ہوئی۔ کئی تصویریں لی گئیں۔ راؤ صاحب سے اشاعتی کام، جو وہ ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، کے بارے میں کچھ دیر تک۔ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ہم نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں اعلیٰ پائے کی مطبوعہ کتابوں کو بھی شائع کریں۔ طے پایا کہ نارنگ صاحب اور میں ان کو ایک ایک مطبوعہ کتاب بابت اشاعت دیں گے۔

ہوٹل میں سب رس قومی زبان اور نگار کے تازہ پرچے رکھے ہوئے تھے۔ پروفیسر عتیق احمد اور ان کی اہلیہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ بیگم عتیق مریم سے گفتگو کرتی رہیں

نارنگ صاحب سے ان کے کمرے میں افسانہ نگار خاتون انٹرویو لے رہی تھیں ڈاکٹر سید قادر حسین نے اپنی کتاب "مولوی محمد اسماعیل میرٹھی" اور افسر صدیقی امروہی نے اپنی کتاب "مصحفی، حیات و کلام" دی۔ محمد علی صدیقی نے اپنی کتابیں "نشانات اور توازن" بھجوائی تھیں۔ واحد راشدی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پروفیسر نجمہ صدیقی صاحبہ (دہلی یونیورسٹی) کے نام پیغام دیا۔ حبیب بنک کی جانب سے ایس ایم وسیم صاحب نے کیلنڈر اور خوبصورت ڈائریاں تحفتاً دے دیں۔

رات کے آٹھ بجے بوٹ کلب میں اردو ترقی ڈکشنری بورڈ کی جانب سے عشائیہ کی پُر وقار تقریب میں کراچی کے دانشوروں، سرکاری آفیسروں، بیگمات، پبلشروں اور قلمکاروں سے خاصی ملاقات رہی بوٹ کلب سمندر کے کنارے واقع ایک کشادہ عمارت ہے۔ محمد علی صدیقی بے حد محبت اور اپنائیت سے ملے، ان کی شفاف اور کھری شخصیت سے میں متاثر ہوا۔ انفارمیشن سیکرٹری مسٹر کریم اور ان کی بیگم سے مل کر خوشی ہوئی۔ مشفق خواجہ سے گفتگو رہی انہوں نے تخلیقی ادب کے پیکیٹ دیئے اور کہا "پاکستان سے جو کچھ منگوانا ہو مجھے لکھئے" بیگم مشفق انتہائی خلیق اور شفیق، مریم کو گھر آنے پر اصرار کرتی رہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے کہا "پھر جب آئیں گے، ہمارے گھر مہمان رہیے گا"

بیگم عالی نے مریم کو گلے لگایا۔

ادا جعفری نے اپنے دو شعری مجموعے دیئے،

عالی صاحب نے کہا "حامدی صاحب، آپ کو پھر بلائیں گے تو ذرا فرصت سے بات ہوگی"۔ سید جعفری صاحب محبت سے ملے، جمیل جالبی اور ان کی بیگم وفد کے ہر رکن سے انتہائی خلوص سے ملے۔ مظہر یوسف اور محسن بھوپالی سے معانقہ ہوا۔ سید حیدر ملک انتہائی خلوص اور شفقت کا والہانہ اظہار کرتے رہے انہوں نے بارہا کہا کہ

وہ میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں، لیکن فرصت؟

فرمان فتح پوری اور بھابی سے گفتگو کا موقع ملا۔ فرمان صاحب نے کہا "آپ سے کھل کر ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ نہ آپ کو گھر بلا سکا۔ کراچی آنے کے لئے میں آپ دونوں میاں بیوی کو دعوت دے رہا ہوں۔ گھر میں مہمان رہیں گے۔ ٹکٹ میں بھجوا دوں گا۔"

میں ان کو حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ میرے منہ سے شکریے کا لفظ بھی نہ نکل سکا۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بے مثال محبت و شفقت کا سامنا کر رہا تھا۔

فرمان صاحب کے ساتھ چند لمحوں کے لیے ہال سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ اردو ترقی بورڈ کی مطبوعات، اپنی کتاب اور لغات کی چھ جلدیں میرے لئے کار میں لائے تھے۔ اور تحفے تحائف۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس محبت کا کیا جواب ہو سکتا ہے

دم ہونٹوں پہ آ کے رکا تھا
یہ کیا شعلہ بھڑکا تھا

انتہائی پر تکلف، متنوع اور مرغن کھانے کے بعد مشاعرے کی کاروائی شروع ہوئی۔ جمیل الدین عالی نے پروگرام کو پیش کیا۔ طے یہ پایا کہ صرف مہمان شعراء ہی اپنا کلام سنائیں گے۔ عالی صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"حامدی کاشمیری شاعر بھی اچھے ہیں، نقاد بھی۔ ایک فاضل آدمی ہیں۔ ناصر کاظمی کی شاعری اور کارگہہ شیشہ گری کے مصنف، دلی میں انہوں نے اساطیری ادب پر جو تقریر کی۔ اس سے میں متاثر ہوا۔"

مشاعرے میں مسعود حسین خان، جگن ناتھ آزاد اور بیدی صاحب نے اپنا کلام پیش کیا۔ میں نے لقول مریم پرندوں والی غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

بام و در پُر نور تھا پرندوں کا
رات، مذکور تھا پرندوں کا

آخر میں نارنگ صاحب سے گذارش کی گئی کہ وہ حاضرین سے خطاب کریں۔ نارنگ صاحب نے انتہائی روانی اور شگفتگی کے ساتھ ایک دلچسپ تقریر کی اور حاضرین سے ہر جملے پر داد و تحسین وصول کی ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

روانگی کے وقت عالی صاحب نے مریم سے کہا :۔
" حامدی صاحب نے مجھے اپنا عاشق بنایا تھا۔ آپ نے میری بیگم کو اپنا گرویدہ بنا لیا"۔

بیدی صاحب نے عالی صاحب کے بارے میں کہا،
" یہ میرے بیٹے ہیں"۔
ایک ہی بیٹا ہے آپ کا"؟ میں نے کہا
"میں نے تمہاری بیگم کو بیٹی بنایا ہے، تم نالایق بیٹے ہو"۔ انہوں نے کہا
سب ہنس پڑے،

غلام ربانی اگرو زور سے گلے ملے۔ شروع کے دنوں میں ہم ان سے زیادہ گھل مل نہ سکے۔ میرا خیال تھا کہ وہ محض ایک سرکاری آفیسر ہیں اور پروٹوکول کے حد درجہ قائل ہیں وہ اپنا کام بہت مستعدی سے کرتے تھے۔ فرداً فرداً سب کا خیال رکھتے تھے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لیکن سیمنار میں میرا مقالہ سننے کے بعد وہ مجھ سے بے تکلفی سے ملنے لگے اور جب نارنگ صاحب نے بتایا کہ وہ سندھی کے مشہور افسانہ نگار ہیں تو میرے دل میں ان کے لیے جذبہ محبت و احترام بڑھ گیا ۔

در ہر نگہ آں شوخ بصد رنگ دگر بود

نارنگ صاحب نے کہا!

"شروع میں ہم اگروو صاحب سے بہت ڈرتے رہے لیکن یہ تو بہت نرم مزاج کے آدمی نکلے۔"

انہوں نے ہر شخص کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ ؎

وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں
مرے تو دل میں اتر گیا وہ

ہوٹل واپس پہنچے تو کمرے میں کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر پریشانی ہوئی کہ ان کی پیکنگ کی کیا صورت ہوگی۔ یہ مسئلہ مسعود حسین خاں صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب اور ابو الفیض سحر کا بھی تھا۔ نارنگ صاحب نے کہا "کوئی مسئلہ نہیں ہے، کارٹن کی پیکنگ ہوگی۔ یہ کام کل بھی ہو سکتا ہے۔"

کارٹنوں کی فراہمی کا مسئلہ تھا۔

رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لئے اس مسئلے کو کل تک ملتوی کر کے سو گئے۔

## اتوار ۱۲ جنوری

خوب سو کر اٹھے۔ آج شام کو لاہور کی روانگی تھی۔ پیکنگ کا مسئلہ بدستور قائم تھا۔ اس مسئلے کا ہر رکن کو سامنا تھا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہوٹل کے ویٹر محمد عمر کے ذریعے ایک کارٹن کا انتظام ہوا۔ اس نے پیکنگ میں مدد دی۔ نوری پریس کی جانب سے ڈایری، پینٹنگس اور کتابیں آئی تھیں۔ پریس کے مالک احمد مرزا جمیل آئے تھے۔ فیروز اینڈ سنز نے کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ بھجوایا تھا۔ اس کے علاوہ ہمدرد والوں کی جانب سے پینٹنگس، کلینڈر، ڈایری اور ڈیمبل ٹایم پیس آیا تھا۔

راؤ صاحب اور یاسمین تحائف لے کر آئے۔ ساڑھے دس بجے ان کے ساتھ بازار جانے کے لیے تیار ہوئے کیونکہ کسی نزدیکی بنک سے ڈالرس کو پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروانا تھا۔ اور سوٹ کیس خریدنا تھا۔ اکرو صاحب آئے مریم سے پوچھا

"شاپنگ کے لئے کب جارہی ہیں؟"

"ابھی جارہے ہیں"

"کیوں شوہر کی جیب خالی کرنے پر تلی ہیں، ابھی اسلام آباد اور لاہور بھی جانا ہے"؟

حیدر علی ملک آئے۔ انہوں نے انٹرویو لیا، لیکن انٹرویو کو ادھورا چھوڑ کر ہم مسز راؤ کے ساتھ بازار گئے۔ مقامی بنک پر جاکر معلوم ہوا کہ بنک دس بجے تک ہی ایکسچینج دیتے ہیں اس لئے یہ مناسب سمجھا کہ ڈالروں کو ادری ٹاورس ہی میں پاکستانی سکے میں بدل دیا جائے۔

صدر بازار سے اٹیچی خریدی،

جلدی جلدی ہوٹل واپس آکر ہم نے بقیہ ماندہ کتابوں کی پیکنگ کروائی۔ عمران پھرتی سے یہ کام کرتا رہا۔ عالی صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے "لاحاصل" اور "دعا کر چلے دیں"۔ دو سفرنامے "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" وہ پہلے ہی عنایت کرچکے تھے۔ حیدر علی ملک پھر آگئے۔ انٹرویو کا بقیہ حصہ مکمل ہوا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بھاگ دوڑ کا عالم تھا۔

لنچ کے لیے گراونڈ فلور پر آئے۔ مرزا جمیل احمد ELITE PUBLISHER سے ملاقات ہوئی اس سے پہلے پروفیسر محمد ذاکر نسیم سب ایڈیٹر روزنامہ امن کراچی سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر عتیق احمد اور ان کی بیگم تشریف لائیں۔ عتیق احمد نے مضامین پریم چند اور بیگم عتیق نے افسانوی مجموعہ اور نونہال کی کچھ جلدیں دیں۔ بادشاہ بیگم اور بیگم عتیق نے مریم کو تحفے دیئے۔

میں نے کونٹر پر TRAVELLERS CHEQUES اور ڈالروں کو پاکستانی
سکے میں بدلوادیا۔ عالی بھائی آئے۔ انہوں نے کہا "روپے کی ضرورت ہو تو لیجئے گا۔"
میں نے اظہار تشکر کیا۔

ہم صوفہ پر بیٹھے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں کشمیر سے بے حد وابستگی ہے۔ تقسیم سے پہلے
وہ کئی بار سرینگر گئے ہیں۔ وہ ہاؤس بوٹ میں ٹھہرتے تھے۔ اور گلمرگ اور بارہ مولہ
بھی گئے ہیں۔

ہمارے ساتھ لنچ میں عالی بھائی۔ مسٹر راؤ اور یاسمین تھے۔ کھانا کھانے
کے بعد تارنگ صاحب مجھے ایک کونے میں لے گئے اور کہا،

"ان سے ملئے"

میں نے دیکھا ڈھلتی عمر کا ایک ضعیف شخص ماتھے پر بکھرے بالوں اور وضع
قطع سے قلندر جیسا۔

"یہ صادقین ہیں"

میں نے فرطِ محبت سے ان سے ہاتھ ملایا۔ مریم بھی مل کر خوش ہوئیں۔ گاڑھی
چائے کے کپ سے نظریں اٹھا کر انہوں نے مریم سے کہا،

"آپ کشمیری لگتی ہیں۔"

"جی صحیح قیاس ہے آپ کا"

"فنکار کی نظر جو ٹھہری"

بیدی صاحب نے آکر ان سے مصافحہ کیا اور وہ رباعی سنانے کی فرمائش
کی جس میں انہوں نے صاحبِ اولاد نہ ہونے کی توجیہہ کی ہے۔ صادقین نے وہ رباعی سنائی
اس کے بعد انہوں نے دہلی میں اپنے قیام کا ذکر کیا،

روانگی کا وقت قریب آیا۔

ایئر پورٹ سے ٹیلی فون موصول ہو رہے تھے۔ اگر وہ صاحب کی بے چینی

بڑھنے لگی۔ قافلے کی روانگی میں تاخیر ہو رہی تھی اس لئے کہ فہمیدہ بیگم اور رفیعہ سلطانہ غائب تھیں "صبح کی گئی ہوئی ہیں۔ مگر ابھی تک ان کا پتہ نہیں" بیدی صاحب کا انطراب بڑھ رہا تھا۔ اتنے میں وہ آگئیں۔ بیدی صاحب نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

قافلہ ہواری ٹاورس کو خیرباد کہہ کر ایئرپورٹ کی شاہراہ پر تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا۔

ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاونج پہنچے تو سب پُرسکون تھے۔ جوس سرو کیا گیا گپ شپ، لطیفے بازی، قہقہے۔

"وفد اور پھر ادیبوں کے وفد کو قابو میں رکھنا۔ مینڈکوں کو تولنے کے برابر ہے"

"آپ کو آج اس کا خوب تجربہ ہوا ہو گا" مریم نے اگروصاحب سے کہا

"جی ہاں مینڈک پھدک رہے تھے" قہقہہ، مسعود حسین خان نے گرہ لگائی!

نہیں صاحب مینڈکوں کا ہی نہیں، مینڈکیوں کا مسئلہ بھی تھا۔

قہقہہ!

اسلام آباد ایئرپورٹ کا وی آئی پی لاونج بہت کشادہ اور خوبصورت ہے، لاونج کے اندر قدم رکھتے ہی ضمیر جعفری، شفیق الرحمان، نظیر صدیقی، قونصل خانے کے عہدیدار، بھارتی سفارت خانہ (کراچی) کے آفیسرز اور امتیاز انصاری نے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان ریڈیو اسلام آباد کے نمایندے بیدی صاحب کا انٹرویو لینے لگے۔

قافلہ پروٹوکول کے ساتھ ہوائی اڈے سے ہندوستانی سفیر مسٹر ایس کے سنگھ کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ جہاں استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

بہت شاندار تقریب تھی۔ سفارت خانے کے عہدہ دار، ان کی بیگمات، اخباری نمایندے، صحافی، اعلیٰ سرکاری افیسر اور سرکردہ ادبا، اور شعرا جمع تھے۔

محفل کا رنگ جم چکا تھا۔

ڈان کے نمائندے اور ان کی بیگم سے ملاقات ہوئی۔ آزاد صاحب لوگوں کے لیے مرکز توجہ بن گئے۔ ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ آزاد صاحب نے اپنے واقف کاروں اور قدر دانوں کے ہجوم میں "مہمان بنکے آیا ہوں" والی مشہور غزل اپنے مخصوص ترنم سے سنائی۔ ایک سماں بندھ گیا۔ غزل سناتے ہوئے آزاد صاحب حد درجہ جذباتی ہوئے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں اور سامعین میں سے اکثر کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

حد درجہ تکان محسوس ہونے لگی۔ میں مسعود حسین خان کے قریب بیٹھ گیا۔

مریم بھی آگئیں وہ بھی سفر کی تکان محسوس کر رہی تھیں۔

"ہمارے دو درویش الگ تھلگ بیٹھے ہیں"۔ مریم نے کہا

"دو درویش یا دو دیوانے"؟ میں نے کہا،

"ہم تو اپنے بس میں ہیں لیکن یہ سب پرائے بس میں ہیں" مسعود صاحب بات سے بات نکالنے میں کمال رکھتے ہیں۔

بیدی صاحب، شفیق الرحمان اور مسٹر سنگھ سے ہمکلام تھے۔ ویسے وہ محسوس کر چکے تھے کہ ہم سب تھکاوٹ محسوس کر رہے ہیں۔ مسکرا کر بولے،

"کیا کروں، گلاس کو چھوڑنا مناسب نہیں"

"یا گلاس آپ کو نہیں چھوڑتا ہے"؟ میں نے کہا،

نارنگ صاحب جنگ کے نمائندے کو سمجھا رہے تھے کہ اعلیٰ تخلیقی ادب بغاوت کے مترادف ہوتا ہے یہ حکومتوں کی سرپرستی سے الگ ہو کر بھی پھلتا پھولتا ہے۔"

آخر رخصت کی گھڑی آگئی۔ ہم سنگھ صاحب کا شکریہ ادا کر کے اسلام آباد سے راولپنڈی پہنچ گئے۔ اسلام آباد کا سفر انتہائی کشادہ اور روشن شاہراہ پر برق رفتاری

سے طے کیا گیا۔ ہم شالیمار ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔

شالیمار ہوٹل کے باہر کار سے اتر کر سردی کا احساس ہوا لیکن ہوٹل میں قدم رکھتے ہی گرمی محسوس ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہم کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانا گرم گرم تھا تلی ہوئی مچھلی، مرغ، سبزی، پلاؤ، رایتہ، گوشت سبزی، سلاد اور پھر سویٹ ڈشز

مسعود حسین خان اور رفیعہ سلطانہ کو کتابوں کا ایک ایک بنڈل نہیں مل رہا تھا وہ ہر جگہ کتابوں کو ڈھونڈتے رہے۔ فہمیدہ بیگم کی کئی چیزیں غائب تھیں۔ کتابوں کے علاوہ اوڈکس کا بڑے سائز کا ٹیبل لیمپ اور بریف کیس، جس میں اراکین وفد کے مضامین تھے ان کی پریشانی میں ہم سب شریک تھے۔

## سوموار۔ ۱۳ر جنوری

جوش ملیح آبادی کے صاحبزادے سجاد حیدر خروش، ان کی اہلیہ اور ان کی دو لڑکیاں بیدی صاحب سے ملے۔ انہوں نے بیدی صاحب سے کہا کہ وہ جوش صاحب کا غیر مطبوعہ کلام چھپوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جوش کی رباعیوں کے مجموعے اراکین وفد میں تقسیم کئے۔ ان کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ بھارت میں جوش مقبول ہیں اور وہ لغابات اردو میں شامل ہیں۔

پروین سید فنا کے شوہر ریٹائرڈ بریگیڈیر سعید احمد ملنے آئے۔ انہوں نے بیدی صاحب، نارنگ صاحب اور ہم میاں بیوی کو گھر آنے کی دعوت دی۔

کاروں کا قافلہ روانہ ہوا۔ آگے آگے سکوٹر سوار ESCORT کرتا ہوا اور پیچھے پیچھے پولیس کی جیپ، ڈرائیور نے کہا کہ یہ SONNY کار ہے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار میں بکتی ہے۔ سڑکوں پر کاریں ہی کاریں بھاگ رہی تھیں۔ کشادہ اور چکنی شاہراہ کے کنارے شیشم کے پیڑ تھے۔ ان کے پیچھے سرسبز جنگل سڑک
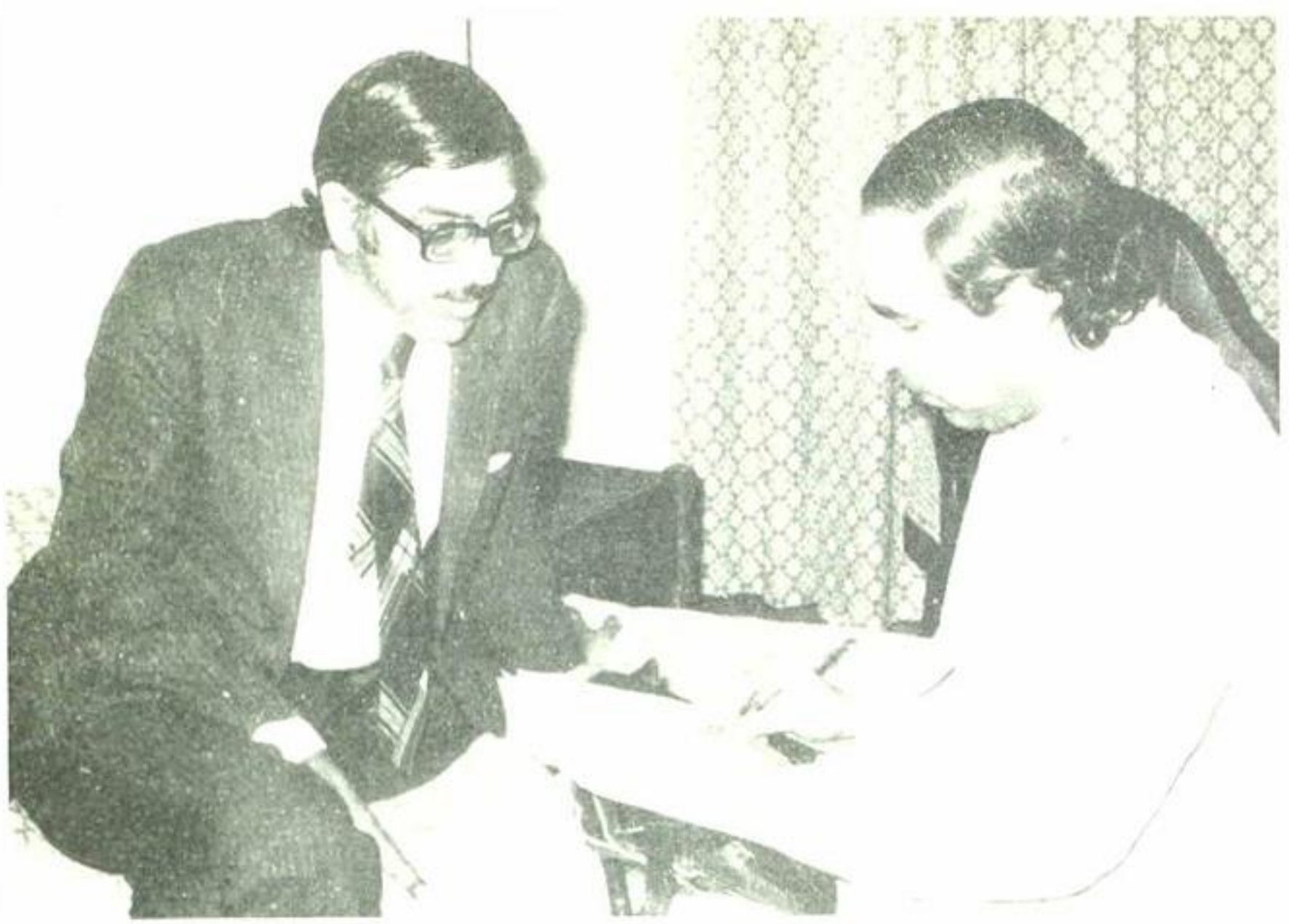
حیدر علی ملک ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا انٹرویو لیتے ہوئے

بیگم حامدی کاشمیری    پروین شاکر    فاطمہ حسن

دائیں سے بائیں:۔ محمد ذاکر، نسیم لیسمین راؤ، بیگم حامدی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، حمید علی ملک۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر حامدی کاشمیری

کے بیچ میں مصلّیٰ سبزہ۔

۵ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ڈرائیور نذر محمد نے میر مہر علی شاہ کے مزار کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کہنے لگے "بہت بڑے بزرگ ہیں۔ سالانہ عرس پر عام تعطیل ہوتی ہے"۔ انہوں نے دوسرے مزار کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ بری امر سرکار کا مزار ہے۔ کسی شخص کو سزائے موت دی گئی وہ پیر کے پاس گیا۔ ان کی دعا سے وہ بری ہو گیا۔ جب سے بری امر سرکار کے نام سے مشہور ہوئے۔"

اسلام آباد میں شاہ فیصل مسجد کی زیارت بھی نصیب ہوئی یہ مسجد فن تعمیر کا حیرت انگیز نمونہ ہے اور زیر تکمیل ہے۔ اسلام آباد ایک جدید شہر ہے۔ یہاں سرکاری دفاتر اور مختلف ادبی اور ثقافتی ادارے ہیں۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کو جڑواں شہر کہا جاتا ہے۔ اسلام آباد کی جدید طرز کی عمارتیں امارت اور خوشحالی کی مظہر ہیں۔ عمارتوں کی چھتیں قدرے جھکی ہوئی ہیں۔ یہ کشمیر کے مکانوں کی چھتوں کی یاد دلاتی ہیں۔

پی اے ایل میں کرنل شفیق الرحمان اور ان کے دفتر کے لوگوں نے ہمارا استقبال کیا۔ شفیق الرحمان اردو کے مشہور افسانہ نویس اور مزاح نگار ہیں' دراز قد سفید بال' بارونق چہرہ' صحت مند گسرتی جسم' بلیو سوٹ میں ملبوس' خاصے توانا نظر آرہے تھے۔ دفتر میں شفیق الرحمان نے اپنے ادبی سفر کے بارے میں بتایا۔ "ادب سے مجھے بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ مزاح کی طرف طبیعت راغب تھی۔ دوستوں کی صحبت کا بھی اثر پڑا۔ سب کھلنڈرے اور باغ و بہار دوست تھے۔ سب سے پہلے میری کتاب دجلہ چھپی پھر افسانے لکھے' سفرنامے لکھے' شروع ہی سے میں کرشن چندر کا معتقد تھا۔ میں نے کئی بار اس سے اصلاح لی ہے۔ کنھیالال کپور

سے دوستی تھی۔ کپور صاحب اور میں نے دو بھائیوں چودھری نذیر اور چودھری رشید کو، جو ہماری خدمت کرتے تھے، دو کتابیں چھاپنے کے لیے دیں۔ میں نے "شگوفے" اور انہوں نے "سنگ و خشت" دی۔ انہوں نے چھاپیں اور اس طرح سے ان کے مکتبہ جدید کی بنیاد پڑی۔

لائبریری میں چائے نوشی کے بعد اکاڈمی کے ریسرچ سکالرز، اقبال یاسر اور نکہت سلیم سے گفتگو ہوئی۔ مقبول عامر اور اقبال یاسر نوجوان شعرا ہیں اور نکہت سلیم کہانیاں لکھتی ہیں۔

شفیق الرحمان نے پاکستان اکاڈمی آف لیٹرز کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی کھڑے ہو کر بورڈ پر نقشہ جات اور اعداد و شمار سے اکاڈمی کی کارگزاریوں کو سمجھاتے رہے۔ اکاڈمی کو ہر سال ستر لاکھ روپے کی گرانٹ ملتی ہے۔ اکاڈمی کتابیں چھاپتی ہے۔ ادیبوں کو کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے۔ پاکستانی قلمکاروں کی ایک DIRECTORY زیر تکمیل ہے ہر سال بڑے پیمانے پر سیمناروں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اور سیمناروں میں پڑھے گئے مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔

شفیق الرحمان نے کہا۔ اکاڈمی کی نئی عمارت زیر تعمیر ہے۔ اس میں ادیبوں کیلئے ایک مہمان خانہ بنوانے کا منصوبہ بھی ہے۔ اکاڈمی اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں مثلاً بلوچ، پشتو، ملتانی اور چترالی زبان و ادب کو فروغ دینے کے اقدامات کرتی ہے۔ عبدالعزیز بھٹائی اور وارث شاہ کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

شفیق الرحمان نے ازراہ مذاق کہا،

خوشحال خان خٹک کہتے ہیں۔ سرحد نے پاکستان کو دو آدمی خوشحال خٹک اور پریشان خٹک دیئے ہیں اور آپ کیا چاہتے ہیں؟"

تصویریں لی گئیں۔ ٹیلی ویژن نے شارٹس لیے۔

لنچ کا اہتمام طباق ریسٹورنٹ میں کیا گیا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ مرغ کی اقسام کے لیے مشہور ہے۔ مرغوں کی متنوع قسمیں لائی گئیں، نکہت سلیم اور اقبال یاسر میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ نکہت سلیم سے افسانے میں خارجیت اور علامیت کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اقبال یاسر کے چہرے پر متانت ہے۔ وہ نئی غزل کے شاعر ہیں۔ ان سے نئی غزل میں علامت نگاری کے موضوع پر تبادلہ خیال ہوا۔

لنچ کے بعد اسلام آباد سے واپس شالیمار ہوٹل راولپنڈی گئے۔

ایک گھنٹے کے وقفے میں کمر سیدھی کرلی۔

مریم اخبارات کو دیکھتی رہیں۔

ساڑھے چار بجے پھر اسلام آباد گئے۔ اسلام آباد ہوٹل کے زیر زمین خوبصورت کشادہ اور آراستہ ہال میں اسلام آباد اور راولپنڈی کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک بے مثال اجتماع تھا GET TOGETHER کا اہتمام پاکستانی اکاڈمی آف لیٹرز نے کیا تھا۔ اس میں پشاور کے ادیب بھی مدعو تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ صحافی، عالم، سرکاری افسر، عمائدین شہر اور دانشور موجود تھے۔ شفیق الرحمان اور اگرو صاحب میزبان تھے۔ سب سے پہلے لطیف کاشمیری سے ملاقات ہوئی۔ ہم فرط محبت سے گلے ملے۔ لطیف کاشمیری مشہور افسانہ نگار اور خاکہ نگار ہیں۔ مری کی لائبریری کے آفیسر ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں سری نگر تشریف لائے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد بارہمولہ کے گاؤں شیری کے رہنے والے تھے۔ وہ غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے اور یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ سیمنار "جدید اردو تنقید، نئے تناظر" کے آخری اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔

"جب سے آپ کراچی آئے ہیں۔ میں برابر میڈیا کے ذریعے رابطہ قائم کیے ہوئے

تھا۔ کل ہی آپ سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن دیر ہوگئی تھی"۔ لطیف کاشمیری مری سے آگئے تھے۔ کشمیری خدوخال، دراز قد، کم گو، مفکر، بااخلاق۔

ڈاکٹر ایوب مرزا گرمجوشی سے ملے۔ میں نے کہا "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" سے آپ بھی فیض کی طرح لافانی ہوگئے۔

"یہ فیض ہی کا فیضان ہے"۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کے سر کے بال چاندی بنے ہوئے۔ چہرے پر بشاشت اور تازگی۔

میں نے زینے سے اترتے ہوئے دراز قد کے آدمی کو دیکھا یہ رشید امجد ہوں گے دل نے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کو گلے لگایا۔ وہ جوشِ محبت سے ملے۔

"میں نے سنا کہ آپ بھی وفد میں ہیں اس لیے آگیا" وہ بولے "میں آپ سے ملنے کے لیے بے قرار تھا" میں نے کہا افسانے میں نئی حسیت کے مرقع کار میرے سامنے کھڑے تھے۔

میں نے مریم کا تعارف کرایا۔ وہ مریم سے مل کر بے حد خوش ہوئے "میں نے آپ کے اکثر افسانے پڑھے ہیں" مریم نے کہا

یہ رکھ لیجئے، صرف آپ کے لیے ہے۔ ایک نیا رسالہ ہے۔ میں نے ان کا تحفہ لیا۔ رشید امجد نے مجھے اپنے افسانوی مجموعے مثلاً "بت جھڑ میں خود کلامی" سے پہلے ہی نوازا تھا میں نے شکریہ ادا کیا۔

"یہ اردو ادب کی علم جاری ہے"۔ ان کی درازی قامت کے بارے میں فقرہ کسا گیا۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

انہوں نے مجھے منشا یاد اور مرزا حامد بیگ سے ملوایا۔ منشا یاد سے ملنے کا میں بے حد مشتاق تھا۔ ان کے بعض بلند پایہ افسانے نظر سے گزرے تھے۔ ہم بغل گیر ہوئے۔
مرزا حامد بیگ میرے لیے بہت مانوس نام تھا۔ ان کی ذہانت اور

تخلیقیت کا ذہن پر گہرا نقش تھا۔ ان سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔ نثار ناسک، سلطان رشک، حسن عباس رضا۔ ممتاز مفتی، منور ہاشمی، عنایت اللہ، مسز اختر جمال، ثاقبہ رحیم الدین۔ متین فکری۔ اختر ہوشیار پوری، پروین سید فنا، بلقیس ظفر، کہکشاں ملک، فیض چترالی، صدیق سالک، سرفراز قریشی، ثریا فرمان، حسن بزاؤ اور سجاد حیدر سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی موٹاپے کے باوجود عصا کو لے کر گھوم پھر رہے تھے وہ ایک ایک کرکے اراکین وفد سے ملے۔

مجھ سے ملے تو کہا،

"آپ کو خوب پڑھا ہے۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔"

"اشتیاق تو مجھے آپ سے ملنے کا تھا۔ آپ کی کتابیں پڑھ کر ہوش سنبھالا ہے۔"

ضمیر جعفری نے کہا،

"غلام رسول نازکی ٹھیک ہیں؟"

مجھے خوشی ہوئی کہ سرینگر کے ایک معزز ادیب کو پاکستان کا ایک بڑا شاعر یاد کر رہا ہے۔

چائے نوشی کا آغاز ہوا۔

لوگوں کی بھیڑ میں نثار ناسک۔ سلطان رشک اور دیگر نئے ادیبوں نے راستہ بنایا اور مجھ سے ملے،

"آپ کی چیزیں پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

نوائے وقت کے مدیر اختر امان تیاک سے ملے۔ بال کھچڑی بنے ہوئے خوش شکل، مخلص، ہنس مکھ، انہوں نے کہا۔

"بھارتی وفد کے آنے پر ہم نے نوائے وقت کا خاص شمارہ شایع کیا ہے۔ اس میں بھارتی ادیبوں کی نظم و نثر کے علاوہ ان کی تصویریں بھی ہیں۔ اس میں آپ

کی غزل اور مضمون کا اقتباس بھی شامل ہے۔"

"وہ شمارہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ پہلے ہی آپ کی بیگم کو دے چکا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

اس تقریب میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ڈاکٹر نظیر صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ لطیف کاشمیری، منشایاد اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے منشایاد کے یہاں آنے کی پرزور دعوت دی۔ لیکن شیر محمد اور یاسر اقبال نے وفد کے ساتھ ہی چلنے کی تاکید کی۔

رات کے نو بجے ڈنر کے بعد اگر وصاحب سبھی اراکین وفد کے ساتھ آیندہ پروگرام کی تفصیلات طے کر رہے تھے، اتنے میں اطلاع ملی کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ جو راولپنڈی کے ہیں۔ ہم دونوں معذرت کر کے اٹھے۔ راہداری میں نسیم اور ان کے شوہر تھے۔ نسیم جواہر نگر سرینگر کے غلام قادر خان کی صاحبزادی ہیں اور خالد بابا اُن کے شوہر ہیں۔ ان سے مل کر خوشی ہوئی وہ گھر آنے پر اصرار کرنے لگے۔ میں نے فرصت کی کمی کی بنا پر معذرت کر لی۔ انہوں نے کچھ دیر تک مریم کے ساتھ باتیں کیں۔ منشایاد کے گھر سے ڈاکٹر ایوب مرزا کا ٹیلی فون آیا۔

"ہم آپ کے لئے گاڑی بھیج دیتے ہیں۔"

میں نے معذرت کر لی اور کہا وفد کی میٹنگ میں شرکت ضروری ہے۔

## منگلوار۔ ۱۴ جنوری

نو بجے صبح لطیف کاشمیری آئے۔ انہوں نے اپنی نئی کتابیں دیں۔ انہوں نے کہا پاکستان میں میری کتابوں کی اشاعت ثانی کے ضمن میں انہوں نے شیخ عبد السلام سے بات کر لی ہے۔ ان سے لاہور میں ملاقات ہو گئی۔ لطیف کاشمیری ہمیں مری لے جانے کے بہت خواہش مند تھے۔ لیکن وقت کی تنگی کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔

"آپ پھر آئیں گے تو مری ضرور تشریف لائیں گے۔"

"انشاء اللہ!۔۔۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

رشید امجد آئے۔ ہم نے اکٹھے چائے پی لی۔ میں نے ان کو "ناصر کاظمی کی شاعری" دی اور ایک مقالہ "منٹو کا تخلیقی ذہن" ان کے رسالے کے لیے دیا۔

رشید امجد سری نگر میں مائیسمہ میں تقسیم سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ سات سال تک وہیں پہلے برن ہال سکول میں زیر تعلیم رہے۔ والد قالینوں کے نقاش تھے پاکستان آنے کے بعد رشید امجد کو اردو زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے سکول میں فوراً داخلہ نہ مل سکا۔ والد صاحب راستہ کھلنے کے انتظار میں رہے اور انتقال کر گئے۔

رشید امجد نئے افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ہم اردو زبان کی اہمیت علاقائی تعصبات، قدیم و جدید کی کش مکش، نئے ادبی شعور اور نئی نسلوں کی ذہنی پراگندگی کے مسایل پر گفتگو کرتے رہے۔

دس بجے صبح علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی جانے کا پروگرام تھا۔

ہم کمروں سے نکلے تو معلوم ہوا کہ ریڈیو کے نمایندے انٹرویو لینے کے لیے آئے ہیں۔ وہ خلیق انجم کے کمرے میں تھے انہوں نے بیدی صاحب اور نارنگ صاحب کے انٹرویو ریکارڈ کیے۔ میر عبدالعزیز اڈیٹر انصاف تشریف لائے۔ معمر خلیق منکسر المزاج۔ ہم زور سے گلے ملے اور کشمیری میں گفتگو کرتے رہے وہ ہمیں گھر بلانے پر مصر تھے۔ لیکن ہماری مصروفیت کا حال سن کر مایوس ہو گئے۔ انہوں نے کشمیری زبان میں کتابیں اور اخبارات دیے۔

ریڈیو کے نمایندے سرفراز صاحب سے طے ہوا کہ وہ کار میں بیٹھ کر میرا انٹرویو ریکارڈ کریں گے چنانچہ بھاگتی کار میں، میں اردو کی حالت، کشمیری زبان و ادب، نئی تنقید کے امکانات اور نئی شاعری کے بارے میں سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ میں نے

دو غزلیں بھی ریکارڈ کرائیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کھلے۔ صاف، روشن اور سرسبز علاقے میں ہے۔ کئی بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ بڑے لائبریری ہال میں کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میٹنگ ہال جس میں اراکین وفد، اساتذہ، ریسرچ سکالر، طلبہ اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار جمع تھے، بہت وسیع ہے۔

شیخ الجامعہ غلام علی اعلانا صاحب نے بہت گرمجوشی سے وفد کا خیر مقدم کیا۔ نہایت خلیق اور نرم گفتار، اردو سندھی لہجے میں بولتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان صوفیوں کی سرزمین ہے۔ صوفی جنگ نہیں چاہتے۔ اعلانا صاحب لباس اور وضع قطع سے خود بھی صوفی لگتے ہیں۔ انہوں نے سندھی میں شیخ اعجاز کی نظم پڑھی اور اس کا خلاصہ اردو میں سنایا۔ یہ نظم شاعر نے اپنے دوست نراین شام کے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد بھارت جانے پر لکھی ہے۔

"ہمارا قول و فعل ایک ہے۔

ہم ایک ہی ہیں۔

اس لیے میں اس پر گولی کیسے چلاؤں۔"

یونیورسٹی کے ایک جواں سال لیکچرار کامران نے سلیقے اور اعتماد کے ساتھ مہمانوں کا تعارف کرایا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار محمد صدیق خان شبلی نے یونیورسٹی کی خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا۔

انہوں نے کہا "جن ادیبوں کی چیزیں ہم نے پڑھی ہیں۔ آج ان کو روبرو دیکھ کر اپنی خوش بختی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔"

اردو کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ء سے یہ زبان تہذیبی ضرورت تھی۔ آج یہ مادّی ضرورت بن گئی ہے اور آج زندگی بن گئی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، مصرہ مریم

غلام ربانی اگرو، مصرہ مریم، شری چترویدی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

مصرہ مریم، چترویدی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم۔

اراکین وفد، لاہور کے ادیبوں کے ساتھ

انہوں نے کہا کہ یونیورسٹی میں مواصلاتی ذرایع، ویڈیو، ریڈیو اور لیکچرز کے ذریعے تعلیم دی جا رہی ہے۔ فاصلاتی تعلیم خود آموزی کا تجربہ ہے۔ تعلیم کے مختلف شعبے کام کر رہے ہیں، ٹیکنکی، زراعتی، ادبی سائنسی اور اسلامی۔

آخر میں یونیورسٹی کے قیام، اغراض و مقاصد تعلیمی وسعت اور عمومی توسیع کے بارے میں ایک دلچسپ معلوماتی فلم دکھائی گئی۔

دائیں جانب اگر و صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ نظیر صدیقی، صدر شعبہ اردو نے اپنی تصنیفات کا ایک سیٹ دے دیا۔ یونیورسٹی کی جانب سے سرخ گلاب کے ساتھ کتابوں کی پیکیٹ پیش کئے گئے۔ ہر پیکیٹ کے ساتھ ایک پارکر بال پوئینٹ بھی تھا۔

ہم نارنگ صاحب کے ہمراہ باڑا بازار گئے۔

"نیرنگِ خیال" کے اڈیٹر سلطان رشک سے ملے۔ ان کا لڑکا ندیم باڑا بازار لے گیا۔ ہر طرف بدیسی مال کے انبار لگے تھے۔ ہم نے تھرماس۔ شیونگ سیٹ اور اوئل آف اوے لے لیا۔ پھر پیدل چلتے رہے۔ فٹ پاتھ پر مال ہی مال خریداروں کا اژدحام، مجھے چاندنی چوک دہلی کا بازار اٹھ آیا۔ بازار کے سرے پر کلاں بازار میں دو تین دکانوں میں قراقلی ٹوپیاں دیکھیں۔ آخر میں آزاد کشمیر کیپ ہاؤس میں سودا پٹ گیا۔ نارنگ صاحب اور میں نے ٹوپیاں بنوانے کا آرڈر دیا۔ مریم نے چند اور قراقلی کھالیں خرید لیں۔

باڑا بازار سے ہم سیدھے مقتدرہ قومی زبان گئے۔ وہاں تین بجے دن استقبالیہ کا پروگرام تھا۔ ہم نے لنچ گول کیا۔ ہم واقعی پُر تکلف اور مرغن کھانے کھا کھا کے تنگ آ گئے تھے۔

مقتدرہ میں باہر لان میں کھلی اور فرحت بخش دھوپ میں استقبالیہ کی کاروائی جاری تھی۔

ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب کے مختلف کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۸۳ سے مقتدرہ کے صدرنشین ہیں۔ وہ تحقیقی علمی اور تنقیدی میدانوں میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی چالیس سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔

وحید قریشی صاحب نے پُرجوش انداز میں وفد کا استقبال کرتے ہوئے ادبی وفود کے تبادلوں پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ مقتدرہ قومی زبان اردو کی ہمہ گیر ترقی کے لیے معروف کار ہے۔ یہ اردو کو دفتری زبان بنانے کے عمل میں سہولیات فراہم کرتا ہے۔ اس ادارے میں وضع اصطلاحات کا کام بھی سائینسی طریقوں پر جاری ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھ سے کہا،

"آپ کی کتابیں کراچی میں شفق خواجہ نے پڑھنے کو دی ہیں"۔

میں طاؤس بانہالی سے زور سے گلے ملا۔ میانہ قد کے ذہین، دردمند اور خوش رو انسان، جذبات سے تھرتھراتا وجود ـــ "آپ کو گھر لے جانے کی حسرت دل میں رہ گئی"۔ وہ بولے

طاؤس صاحب ۱۹۴۸ء سے پاکستان میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر کی بہت یاد آتی ہے کشمیری ادیبوں سے صرف ریڈیو کا واسطہ ہے۔

جلسہ گاہ میں میری بائیں جانب خالی کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے سرگوشی میں بولے،

"حامدی صاب آگیا بلایہ"

"تو ہی؟"

"میں طاؤس بانہالی ہوں"

ہم نے ساتھ ہی کتابوں کی نمائش دیکھی اردو ٹائپ رائیٹر اور ٹیلی پرنٹر دیکھا۔

اعجاز راہی سے گفتگو ہوئی۔ ادارے کی طرف سے کتابوں کا تحفہ دیا گیا۔

لوک ورثہ گئے،،

ایک بڑے ہال میں شیشے کی الماریوں میں پاکستان کے علاقائی تہذیبی نوادر محفوظ ہیں۔ خاص طور پر کیلاش، قیصر آباد، بلوچستان اور سندھ کے لوگوں کے زیورات، ملبوسات، ظروف، لکڑی کا سامان، فرنیچر، صنعت و حرفت کے نمونے، گھریلو دستکاریاں، مثلاً چرخے وغیرہ نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ لوک گانوں اور کتھاؤں کے کیسٹ بھی رکھے گئے ہیں انہوں نے اراکین کو تحفوں سے نوازا۔

ہندوستانی سفارت خانے میں سنگھ صاحب سے ملنے گئے۔ سنگھ صاحب کی نظر سیاسیات پر گہری ہے۔ وہ اردو زبان سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔ شعر و شاعری سے شغف ہے۔ پانڈے صاحب اور دیگر حضرات سے ملے۔ باہر نکلے تو ایک خوبرو کشمیری نوجوان بال کرشن جو اننت ناگ کے ہیں، سے مل کر خوشی ہوئی۔ بال کرشن بیوی کے ساتھ پاکستان میں مقیم ہیں اور ہندوستانی سفارت خانے سے وابستہ ہیں

ہمارے ساتھ کار میں مسٹر ماتھر بیٹھے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے نمائندہ ہیں انہوں نے اطلاع دی۔ آل انڈیا ریڈیو سے وفد کی مصروفیت کی خبریں برابر نشر کی جا رہی ہیں۔

مقتدرہ کی جانب سے چار بجے دن ہولی ڈے ان میں عصرانے میں کئی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور اعجاز راہی میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ وہ بلند آواز میں کہنے لگے۔

" حامدی کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ آپ پاکستان کے لکھنے والوں خاص کر نئے لکھنے والوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس بات سے ہم بہت متاثر ہیں۔ ہمارے لیے سارے پاکستانی ادب کو کور کرنا مشکل ہے۔ پچھلے دس سال سے

میں ادب کے ORBIT سے نکلا ہوں۔ کچھ مصروفیات بہت ہیں۔ ادھر ہندوستانی کتابیں بھی نہیں ملتیں۔"

چائے پیتے ہوئے مرزا حامد بیگ، اعجاز راہی، اقبال یاسر اور ڈاکٹر ایوب مرزا سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔

مریم نے مجھے انور رضا سے ملایا۔ خوبصورت، زیرک، خوش گو۔ ساڑھی میں ملبوس، وکالت پیشہ اور دو سفرناموں کی مصنفہ، کشمیر کو دیکھنے کی آرزو مند!

"مجھے سفرنامے سے بے حد دلچسپی ہے۔ آپ کے سفرنامے پڑھنا چاہوں گی" مریم نے کہا،

"زہے قسمت، ابھی منگوا دیتی ہوں۔"

انہوں نے اپنے شوہر رضا صاحب کو بلایا،

"رضا گھر جا کر میری کتابوں کا ایک سیٹ لے آؤ مریم حامدی کے لئے"

انور رضا اپنے شوہر کے ساتھ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں اس وقت تک مقیم تھیں جب وہاں کے حالات ابتر ہوئے اور پھر سقوط مشرقی پاکستان کا واقعہ پیش آیا۔

مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ اس لئے چائے کے ساتھ سینڈوچ اور سموسے کھا لئے۔

شام ہو رہی تھی۔ جگمگاتی خوبصورت شام!

روشنیوں میں ہوٹل کے لان میں شفاف فوارے اور پس منظر میں جنگلوں کی ہریالی طلسمی منظر پیش کر رہی تھی۔ مرزا حامد بیگ سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، بعض ادبی شخصیات زیر بحث رہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت اور تنقید پر تبادلۂ خیال ہوا، افتخار جالب کے بارے میں انہوں نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ اگر کسی فنکار کے بارے میں ایک لائن بھی کہیں چھپتی ہے وہ اس کا ریکارڈ رکھتے ہیں تب مجھے منظر امام یاد آئے، جو اپنے بارے میں ایک ایک لفظ کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔

ہولی ڈے ان سے نکل کر ہم نارنگ صاحب کے ساتھ غضنفر مہدی صاحب کے دولت کدے پر گئے، پاور شیڈنگ کی بنا پر لائٹ آف تھی۔ ان کی اہلیہ نے شمعوں کی روشنی میں چائے سے تواضع کی۔ مہدی صاحب کے دو بچے رباب اور ثقلین بیحد پیارے ہیں۔ بھابی نے کھانے کی کئی چیزیں پیش کیں۔ لیکن ہمارا پیٹ بھرا تھا۔

ہم فسٹ سیکرٹری جبین صاحب کے یہاں گئے۔

وہ ایک کشادہ خوبصورت کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں۔ کافی لوگ موجود تھے بعض ممالک مثلاً سری لنکا، موزمبیق اور بنگلہ دیش کے سفیر موجود تھے۔ سفیر ہند سنگھ صاحب کے علاوہ پاکستانی سفارت خانے کے معززین بھی مدعو تھے۔ غضنفر صاحب اگروصاحب گردیزی صاحب اور عنایت کبریائی بھی شریک بزم تھے۔

بیدی صاحب میر مجلس تھے۔

بہت دیر تک گپ شپ، لطیفہ بازی اور شعر و شاعری سے محفل گرم رہی، جبین صاحب سے رخصت ہو کر بیدی صاحب، نارنگ صاحب اور ہم پروین یدفنا کے گھر گئے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا بھی موجود تھے۔ فنا صاحبہ اور ان کے شوہر ریٹائرڈ بریگیڈیر سید صاحب نے ہماری بہت خاطر مدارات کی۔ پروین فنا نے اپنا کلام سنایا۔ بیدی صاحب اور میں نے بھی اپنی غزلیں سنائیں۔ فنا صاحبہ نے اپنا مجموعۂ کلام "تمنا کا دوسرا قدم" عنایت کیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے ہمیں رات گئے ہوٹل پہنچا دیا۔ انہوں نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" دے دی۔

بیدی صاحب نے ہمیں اپنے کمرے میں کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ بیدی صاحب ہوٹل کا کھانا کم کھاتے تھے۔ اگرو صاحب ان کے لئے گھر کا

کھانا بنوا کے لاتے تھے۔

ہم نے بہت مزے سے سادہ سا کھانا کھایا۔

اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ٹیلی فون بج اٹھا غلام الدین وانی صاحب تھے ان کے لہجے سے محبت و شفقت پھوٹ رہی تھی۔ ہم سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ طے پایا کہ وہ دوسرے روز بعد دوپہر ہوٹل میں ملنے آئیں گے۔

مریم چیزوں کو قرینے سے رکھنے لگی دوسرے روز لاہور کی روانگی تھی۔ نیند سے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

## بدھوار ۔ ۱۵ جنوری

سب حضرات و خواتین شالیمار ہوٹل کے لاونج میں آ گئے۔ صوفے کی پشت پر شیشے کی دیوار ہے۔ کونٹر کے اوپر ایک بڑا خوبصورت جھاڑ آویزاں ہے۔

قمر رعوینی آئے۔ وہ نیرنگ خیال کے مدیر معاون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سلطان رشک صاحب نے نیرنگ خیال کے پیکٹ بھجوائے تھے۔ لیکن کسی کو نہیں ملے ہیں۔ وہ پوچھ تاچھ کرتے رہے لیکن بے سود۔ ٹیلیفون پر خالد بابا الوداع کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آئے۔ میں نے ان سے پیٹ میں جلن کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہو جائے گی۔ دوا لینے کی ضرورت نہیں۔

ساڑھے نو بجے نذر محمد کار میں کلاں بازار گئے۔ مسعود صاحب بھی آئے۔ انہیں قراقلی ٹوپی خریدنے کا شوق تھا۔ ہم نے جلد جلد ٹوپیاں خریدیں۔

"میں اونچی دیوار کی ٹوپی نہیں لوں گا۔ مجھے غالب نہیں بننا ہے" مسعود صاحب نے کہا وہ صبح ہی سے دہراتے رہے کہ انہیں اونچی دیوار کی ٹوپی نہیں لینا ہے۔

آپ اپنی پسند کی ٹوپی لیجئے۔ ٹوپی کو اعصاب پر سوار نہ کیجئے، نارنگ صاحب نے کہا۔

"میں اپنے اعصاب پر کچھ بھی سوار نہیں کرتا۔ آپ تو تشنج ہی تشنج ہیں۔" ان کا اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا۔ جس میں خلیق انجم کی کسی بات پر نارنگ صاحب غصے میں آ گئے تھے۔

"یہ تشنج تو آپ کا عطیہ ہے۔ آپ جو ٹھہرے ہمارے مرشد خاص نہیں تو ہم ہیں وہی مومن مبتلا" قہقہہ!

مسعود صاحب مزاحیہ موڈ میں تھے کہنے لگے۔

رفیعہ صاحبہ نے موہنجوڈارو میں کہا۔ سارا شہر کھدائی کر کے نکالا ہے۔ تو مسجد بھی نکلی ہوگی۔"

خوب۔ لیکن محترمہ نے آپ کی خوب خبر لی"۔

"پتہ نہیں کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں خیر مجھے شکایت نہیں۔ وہ تو معصومین میں سے ہیں۔"

ہوٹل واپس پہنچے۔ ہلکی سی دھوپ تھی۔ ٹیکسلا جانے کا پروگرام تھا۔ مگر اگروصاحب کا انتظار تھا۔

مریم صوفہ پر اپنے تاثرات لکھ رہی تھیں۔ میں صوفے کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا' بیدی صاحب نے کہا'

"دیکھئے بیگم حامدی' میں نے آپ کو کئی بار کہا کہ حامدی صاحب کو مقالہ لکھ کر نہ دیا کیجئے' دیکھئے خود کس مزے سے بیٹھے ہیں" "آپ کو میرے آرام سے خدا واسطے کا بیر ہے"۔ میں نے کہا

اگروصاحب آگئے'

قافلہ کاروں میں ٹیکسلا روانہ ہوا۔ ہماری کار میں میرے اور مریم کے علاوہ رفیعہ سلطان اور نادرہ تھیں۔ نادرہ شالیمار ہوٹل میں اسٹنٹ سیلز منیجر ہیں، اٹلی

سے ہوٹل مینجمنٹ میں ڈپلوما لیا ہے اور کئی ہزار تنخواہ پاتی ہیں۔ راستے میں مخزیہ لہجے میں پاکستان میں عورتوں کی ترقی اور تعلیم سے کے بارے میں معلومات فراہم کرتی رہیں۔

ٹیکسلا آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے۔ میوزیم کو دیکھا اس میں کھدائی سے نکلا ہوا سازوسامان شوکیسوں میں محفوظ ہے۔ مورتیوں کی تعداد خاصی ہے۔ زیادہ تعداد گوتم بدھ کی مورتیوں کی ہے۔ ان کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات، کانچ اور ہاتھی دانت کی چوڑیاں، نگ والی انگوٹھیاں، سرمہ کی سلائیاں، مونگا اور فیروزہ، تانبے اور مٹی کے ظروف، ملبوسات، سامان حرب وغیرہ۔

میوزیم کو دیکھنے کے بعد سید اصغر شاہ کی کوٹھی پر گئے۔ وہاں ان کے بھائی صفدر شاہ بھی تھے۔ اصغر شاہ مجسم شرافت۔ ٹیکسلا کے بڑے زمیندار، مہمان نواز۔ راجہ احسان بھی موجود تھے۔ محل نما کوٹھی کے خوبصورت لان میں خوشگوار دھوپ میں لنچ کھانے لگے۔ سارا کھانا گھر میں پکا ہوا تھا۔ گرم خوشبودار، متنوع روٹی، نان، مرغ گوشت، سبزیاں، چٹنیاں، گاجر کا حلوا، دہی، تازہ پھل، کولڈ ڈرنکس قہوہ، کھانا بہت مزے سے کھایا۔

سرو و صنوبر اور مخملیں سبزے کو دیکھ کر کشمیر یاد آرہا تھا۔

میزبانوں کا شکریہ ادا کرکے ہم پنجا صاحب گئے۔ یہ حسن ابدال کا علاقہ ہے گنجان اور تنگ گلیوں سے گذر کر ہم ایک محلے میں پہنچے۔ یہاں پنجا صاحب کا گوردوارہ ہے۔ گوردوارہ وسیع رقبہ زمین پر محیط ہے۔ اندر ماحول صاف ستھرا ہے۔ گوردوارہ کے صحن میں مرمر کی ٹائیلیں لگی ہیں جن پر عقیدت مندوں کے نام کندہ ہیں۔ چمن کے گرد یاتریوں کے لئے رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں ایک بڑا لنگر خانہ بھی ہے۔ صحن کے درمیان یک منزلہ عمارت میں گرنتھ صاحب ہے۔

"یہ چشمہ ہے" بیدی صاحب نے کہا،

میں چشمے کے بہتے ہوئے پانی کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس میں مچھلیاں بھی تیر رہی تھیں، پانی اتنا صاف اور شفاف تھا کہ اگر اس میں سوئی بھی ڈالی جاتی، تو وہ بھی صاف نظر آتی۔ مجھے کشمیر کے چشمے یاد آئے، ویری ناگ کے چشمے کا پانی بھی بہت شفاف ہے، لیکن اس چشمے کی بات ہی اور ہے، ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے یہاں سے وہاں تک شفاف شیشہ لگا ہوا ہے، ظاہر ہے یہ گروجی ہی کی کرامت ہے، گوردوارے کی مقدس فضا میں ایک غیر معمولی روحانی سکون کا احساس ہوا چونکہ گوردوارہ خالی تھا، اس لئے سناٹے کے ماحول میں یہ جگہ اور زیادہ روحانی سکون کا گہوارہ بن گئی تھی سرزمین ہند و پاک کی مغربی ممالک کے مقابلے میں یہ خصوصیت ہے کہ یہاں روحانی اقدار کی آبیاری ہوتی رہی ہے، مختلف وقتوں میں بڑے بڑے سادھو سنت اور صوفیائے کرام پیدا ہوتے رہے ہیں، جو انسانوں کو مادی ہوسناکیوں اور نفسانی خواہشات کے خطرات سے آگاہ کرتے رہے، اور روحانی بیداری پر زور دیتے رہے، روحانیت کا احساس یہاں کی مٹی میں ہے، وادیٔ کشمیر تو روحانی پیشواؤں کا مرکز رہی ہے، اسی بنا پر اسے "ریشی وار" کہتے ہیں، کشمیری شاعری میں بھی روحانی اقدار کے تابناک عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے للہ دید اور شیخ نورالدین نورانی تو مشہور صوفی شعراء ہیں، صوفی ہمیشہ دروں بینی، ذات شناسی، صبر، توکل، قناعت، انسان دوستی اور عالمی بھائی چارے کی تعلیم دیتے رہے ہیں اور آج کی سفاک دنیا میں ان قدروں کی ضرورت کتنی ناگزیر ہے!

بیدی صاحب نے کہا،

جب گرو جی اس مقام پر پہنچے تو ان کے ساتھیوں اور مریدوں کو زوروں کی پیاس لگ رہی تھی۔ انہوں نے آس پاس کے علاقے میں پانی کو تلاش کیا۔ لیکن پانی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا' وہ تھک ہار کر واپس آئے۔ انہوں نے گرو جی کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی بڑھتی ہوئی پیاس کا حال بیان کیا۔ گرو جی سوچ میں ڈوبے' وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں پتھر ہی پتھر تھے' انہوں نے ایک بھاری پتھر کو اپنی جگہ سے سرکایا' تو آن واحد میں وہاں سے پانی نکل آیا' اور تازہ پانی کا چشمہ پھوٹنے لگا۔ گرو جی کے مریدوں نے خوب پانی پیا' یہ خبر فوراً پھیل گئی' اور آس پاس کے علاقوں سے لوگ آنے لگے' اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اور میلے کا سماں بندھ گیا'

"یہ دیکھئے حضرات" بیدی صاحب نے جذبہ عقیدت کے سرشار لہجے میں کہا' اور ہاتھ سے اشارہ کیا'

"یہ وہ مقدس جگہ ہے' جہاں سے وہ مقدس چشمہ نکلا ہے اور آج بھی صدیاں گزرنے کے بعد بہہ رہا ہے۔"

میں پانی کی صفائی اور روانی کو دیکھکر "حیرت کی فراوانی" کے تجربے سے گزر رہا تھا کہ بیدی صاحب نے چونکا دیا'

" اس زمانے میں نزدیک کی ایک پہاڑی پر ایک مشہور فقیر خدا اقامت گزیں تھے' ان کا نام شاہ ولی قلندر قندھاری تھا' شاہ صاحب کو ان کے مریدوں نے گرو جی کی آمد اور ان کی معجزہ کاری کے واقعات سنائے' وہ طیش میں آگئے انہوں نے غصے میں ایک چٹان کو پہاڑی کی بلندی سے نیچے سرکا دیا اور چٹان وہیں جا گری'

جہاں گرو جی براجمان تھے۔ گرو جی نے فوراً ہاتھ کے پنجے سے چٹان روک دی۔ چٹان رک گئی اور اس پر پنجے کا نشان رہ گیا۔ جو آج بھی موجود ہے اسی بنا پر اسے پنجا صاحب کہتے ہیں۔ بعد میں دونوں بزرگوں کی صلح صفائی ہوئی گرو جی نے کہا کہ آیندہ جو شخص پنجا صاحب کی زیارت کو آئے گا اس کی عبادت اس وقت تک پوری نہ ہو گی جب تک وہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضری نہ دے گا۔ چنانچہ آج تک ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پنجا صاحب سے واپسی پر ہم نے لوک ورثہ کی دکان سے مہدی حسن، نیرّہ نور، اقبال بانو، امانت علی خان اور فریدہ خانم کے کیسٹ خریدے۔

پانچ بجے ہوٹل پہنچے۔ منشا یاد نے افسانوں کے مجموعے "ماس اور مٹی" اور "خلا اندر خلا" سے نوازا۔ کرنل مسعود اختر شیخ نے "اہلِ کرم" دی۔

دن کو غلام الدین وانی، خالد بابا اور طاؤس بانہالی ملنے آئے تھے۔ انتظار بسیار کے بعد وہ چلے گئے تھے۔ اپنے ان عزیزوں اور بزرگوں کے نہ ملنے کا شدید افسوس ہوا۔ طاؤس بانہالی رقعہ چھوڑ گئے تھے۔

"گرامی قدر حامدی صاحب،

قبلہ حاجی خواجہ غلام محی الدین وانی صاحب اور میر عبدالعزیز صاحب ڈیڑھ بجے سے سوا چار بجے تک ہوٹل ہذا میں آپ کے منتظر رہے۔

وانی صاحب کا فون ــــ ۶۵۱۷۶ اور میر عبدالعزیز کا فون ۴۳۷۴۴۴ ہے ہم لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ ہمیں اطلاع دیجیے کہ آپ مع بیگم صاحبہ ۸۶-۱-۱۷ کو ہمارے ساتھ ہاک بتہ کھائیں گے یا چائے نوش فرمائیں گے۔

نیاز مند

طاؤس بانہالی

ایئرپورٹ جانے کا وقت ہو رہا تھا۔

ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہوٹل والوں نے کمروں سے سارا سامان نکال کر لاؤنج میں اس کا انبار لگا دیا تھا۔ ہم نے مشکل سے اپنے سامان کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ منشا یاد، ایوب مرزا، بریگیڈیر سید، پروین فنا سید اور رشید امجد سے نارنگ صاحب کے کمرے میں ملے۔ ہم ابوالفیض سحر کے ساتھ نیچے آئے۔ تو سارے لوگ ایئرپورٹ روانہ ہو چکے تھے۔ نارنگ صاحب دوستوں میں گھرے رہے۔ اور انہیں اپنے سامان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ان کی پریشانی بڑھ گئی جس نے "خواب عذاب ہوئے" دی۔

رات کے نو بجے لاہور کے ایئرپورٹ پر جہاز اترا باہر خنکی تھی۔

ہمارے استقبال کے لیے کئی ادیب اور شاعر جمع تھے۔ انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، محمد عقیل، ڈاکٹر سلیم اختر، کشور ناہید، سائرہ ہاشمی، شبنم شکیل، عطاالحق قاسمی اکرم چغتائی، سراج منیر، آغا برنی، زاہد مسعود، حسن رضوی اور دوسرے۔

ہمارے ہمراہ جہاز میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور دائرہ کے سیکریٹری غضنفر مہدی بھی آئے تھے۔ انتظار حسین سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ وہ محبت سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر بہت پیار سے گلے ملے۔ ان سے خط و کتابت تھی۔ انہوں نے کارگہہ شیشہ گری کے بارے میں ایک توصیفی خط لکھکر دوستی کی ابتدا کی تھی۔ کشور ناہید نے حد درجہ جوش و جذبے سے سب کا خیر مقدم کیا۔ میں نے دہلی میں براج کومل کے یہاں مارچ ۱۹۸۵ء میں ڈنر کے موقعہ پر لطیفوں کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ عطاالحق قاسمی نے گلے مل کر پوچھا کہ آیا مجھ کو معاصر مل گیا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ حسن رضوی سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے گلے مل کر لوائے وقت کے لیے میرا پیغام ریکارڈ کیا۔ میں نے ادیبوں کے قہقہوں اور باتوں کے شور میں کہا۔ "پاکستان آکر اور یہاں کے ادیبوں سے مل

کہ میرا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا ہے"۔ مسرت کے جذبے سے میرا لہجہ مرتعش تھا۔
ہم لاہور کے پانچ سٹار ہوٹل ہلٹن میں قیام پذیر ہوئے۔ ہلٹن میں قدم رکھتے ہی منیر احمد شیخ سے ملاقات ہوئی۔

"کیا آپ نے مجھے پہچانا؟" انہوں نے کہا
"آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں! لیکن یہ کیا بوڑھے لگ رہے ہیں"۔
"میں اپنی جوانی کو ہندوستان میں چھوڑ آیا ہوں"۔
منیر احمد شیخ دہلی میں پاکستانی ایمبیسی میں پریس اٹیچی کے عہدے پر مامور تھے انہوں نے مجھے ناصر کاظمی پر لکھتے ہوئے ضروری مواد فراہم کیا تھا۔ شفیق دوست!
کمرہ نمبر ۲۲۸ میں ہمارا سامان پہنچا دیا گیا۔
تھوڑے سے توقف کے بعد رات کے ساڑھے نو بجے ہم اگروصاحب کے ہمراہ گورنر پنجاب مخدوم محمد سجاد قریشی صاحب سے ملنے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایرانی وفد کے دیر سے آنے پر وہ ملنے سے معذور ہیں۔ اس لئے ملنے کا وقت صبح نو بجے مقرر ہوا۔

ساڑھے دس بج چکے تھے ہم نوائے وقت فورم میں پہنچے جہاں ادبی مناظرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عطاء اللہ قاسمی نے مناظرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سب خواتین و حضرات کو ایوان وقت میں خوش آمدید کہتا ہوں آج ہم اردو زبان و ادب کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ سب سے پہلے وفد کے قاید محترم کنور سنگھ بیدی سحر سے پوچھتا ہوں کہ پاکستان کا موجودہ دورہ آپ کو کیسا لگا؟"
بیدی صاحب نے کہا "میں پاکستان پہلے بھی آتا رہا ہوں۔ اس دفعہ ہمارے ملک کے بڑے پڑھے لکھے دانشور اور ادیب حضرات کے ہمراہ آنے کا اتفاق

ہوا ہے۔ ہمیں ہر جگہ محبت اور پیار ملا۔ ہر جگہ ہمارے اور آپ کے مذاکرے ہوئے۔ جن سے ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔ انڈیا اور پاکستان کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آنے کی دلی خواہش رکھتے ہیں"۔

سراج منیر نے کہا "ایک عام تاثر یہ ہے کہ ادبی رسالوں کا پاکستان اور بھارت کے درمیان تبادلہ کچھ بہت زیادہ تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا رہا۔ نتیجے میں رجحانات میں کچھ فاصلے پیدا ہو گئے ہیں"۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ :۔ دونوں ممالک کے رسالے کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے ملک میں پہنچ جاتے ہیں اور دونوں ملکوں کے لوگ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا کھلا تبادلہ ہونا چاہیئے۔ اردو کتابوں پر بھی اس کا اطلاق ہونا چاہیئے اور ایک دانشورانہ مکالمہ جس طرح سے ہونا چاہیئے وہ ہو سکے۔ رجحانات کے بارے میں عرض ہے کہ ادب میں تبدیلیاں اس طرح سے تو نہیں آتیں جس طرح سے کلینڈر کے اوراق تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں بہت آہستہ آہستہ رونما ہوتی ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد جس طرح سے حالات بدلے اور جس طرح سے بعض خواب شکستہ ہوئے۔ کچھ نئے خواب دیکھے بھی گئے۔ تو ایک ایسا دور ضرور آیا جس میں قدروں کی شکست و ریخت ہوئی۔ یہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں ہوا۔ پھر نئے معاشروں کی تعمیر کا بھی سوال تھا۔ تو اس کا ادب مختلف اصناف پر بالخصوص شاعری اور فکشن پر بہت اثر پڑا۔ ان دونوں اصناف کے زمین و آسمان بدل گئے۔ میرے خیال میں سب سے بنیادی تبدیلی یہ ہے کہ حقیقت کا تصور بدلا۔ آزادی کے بعد زندگی کو اس کے تمام رنگوں کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی گئی نئے حالات میں تجربات پیچیدہ ہوئے۔ چنانچہ جب تجربہ پیچیدہ ہوتا ہے تو فنکار اظہار کی نئی سطحوں کو چھوتا ہے اور رمزیہ اور علامتی ادب پیدا ہوتا ہے۔

سراج منیر :- آپ کی بات میں غالب عناصر تو وہ ہیں جو عالمی سطح پر ادب میں اس دوران یا اس صدی میں پیدا ہوئے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ دونوں طرف مابہ لاامتیاز رجحانات کیا رہے ہیں۔

حامدی کاشمیری :- غالب انداز میں موجودہ فن کار کا سب سے بڑا مسئلہ وہی ہے جو کہ پوری دنیا کا ہے۔ نئے حالات میں ایک نیا انسان ہمارے سامنے ہے جس کے اپنے مسایل ہیں۔ وہ علاقائیت اور جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک عالمی فکری آب و ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم اسی انسانی صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں۔ جس کا سامنا یورپ والے بھی کر رہے ہیں۔ اگر ہم چند ضمنی رجحانات پر نظر ڈالیں تو ایک چیز جو ہندوستانی ادب میں تیزی سے ابھر رہی ہے وہ یہ ہے کہ موضوعیت کالعدم ہو رہی ہے۔ گذشتہ ادوار میں ہماری ساری توجہ اس بات پر رہتی تھی کہ ایک طے کردہ انداز میں موضوع کو مشخص کریں۔ یہ سماجی مسایل ہیں، یہ غلامی کا مسئلہ ہے، یہ قومیت ہے تو اس طرح ہم ذہن میں موضوعیت کی شناخت کرتے تھے۔ اور پھر پورے ارادے اور سعی سے اسے فن کے قالب میں ڈھالتے تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کے زمانے میں جو ادب پیدا ہوا وہ موضوعیت کا شکار رہا۔ آج ہم موضوعیت سے انحراف کر رہے ہیں ہم ایسے تجربات کی تخلیقی باز آفرینی کرتے ہیں جو ہمارے اندر سے نمود کرتے ہیں جن کی نفسیاتی بنیادیں ہیں اور جو شعور اور لاشعور کی حد فاصل کو پگھلا دیتے ہیں۔ ایک ضمنی رجحان یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں وجودیت کے تعلق سے ہم محسوس کرتے رہے کہ عقاید اور ایقانات ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے لیکن اب کارپاتی ہوں یا عمیق حنفی یقین اور عقیدے کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس کا تعلق بھی عالمی سطح پر بڑے شعرا کے ساتھ رہا ہے۔ ایلیٹ نے خرابہ لکھا اور پورے تہذیبی

المیے کو پیش کیا۔ لیکن بعد کی نظموں میں وہ عقیدے کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسانی صورت حال ایسی ہے کہ عقیدے کی تلاش میں نکلتے ہوئے ہم پھر سرابوں میں محو سفر ہیں۔

جگن ناتھ آزاد:۔ حامدی صاحب نے فرمایا کہ موضوعیت سے ہٹ کر اب ہم علامتی ادب کی طرف جا رہے ہیں بات یہ ہے کہ موضوعی ادب ہمارے یہاں عرصہ سے ایک حقیقت بن کر رہا ہے سوال یہ ہے کہ کیا موضوعی ادب نے ادب کے تقاضوں کو پورا کیا ہے یا نہیں۔ ہمیں ادب کو اس طرح تقسیم نہیں کرنا ہے۔ کہ یہ موضوعی ادب ہے تو اس سے ہمیں فائدہ نہیں ہے یا یہ کہ علامتی رجحان سے ہمیں فایدہ ہے۔ موضوعی ادب میں ایسا نہیں ہوا کہ نقالی ہوئی۔ اچھا ادب تو ہمیشہ مقدار میں کم ہی ہو گا۔ علامتی ادب بھی بہت اچھا ہمارے سامنے آیا ہے جب ہم ادبی تقاضوں پر پورے اترنے والے ادب کی بات کرتے ہیں تو ہمیں علامتی ادب کو بھی اسی معیار پر پرکھنا پڑے گا۔ جس معیار پر ہم اپنے موضوعی ادب کو پرکھتے ہیں۔

سراج منیر:۔ سوال یہ ہے کہ انڈیا میں اس وقت ادب کے کیا رجحانات ہیں اور کیا پاکستان کا ادب انڈیا سے الگ ہے۔

گوپی چند نارنگ:۔ قصہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ سے پہلے ادب میں ہم موضوع کے حوالے سے حدود کا تعین کرتے تھے ادب صرف موضوع نہیں ہے بلکہ یہ اظہار بھی ہے۔ برصغیر میں اردو کا رشتہ علاقائی زبانوں اور بولیوں سے جڑا ہوا ہے۔ علاقائی زبانوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ انسان جس آگہی کے آشوب میں مبتلا ہے اور حامدی صاحب نے بھی جس اس طرف اشارہ کیا۔ وہ تو یکساں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان آپ یہ بتایئے کہ آپ کے ہاں لسانیات

پر جو کام ہو رہا ہے اور ہمارے یہاں بھی ہو رہا ہے اس میں ہمارے یہاں بالخصوص کچھ نئے نظریات آ رہے ہیں۔ ایک یہ کہ اردو کا تعلق کھڑی بولی یا پنجابی سے نہیں ہے بلکہ دراوڑی سے ہے کیا آپ کے یہاں بھی اردو کے آغاز یا جنم کے بارے میں کوئی نئے نظریات آ رہے ہیں۔

مسعود حسین خان:۔ اردو کے سلسلے میں اس قسم کے نظریات نظریات نہیں بلکہ مفروضات، ہیں ہند آرائی زبان کے مسلمات سے نابلد ہونے کی وجہ سے جو لوگ اس میدان میں داخل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے یہ مفروضات پیش کئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جن لوگوں نے اس قسم کے نظریات پیش کئے ہیں ان میں سے کسی کا مطالعہ، علم سنسکرت کی معلومات، ہند آرائی تاریخ پر نظر ایسی ہے جیسی سنتی کمار چیٹر جی، بلاک اور دوسرے ہند آریائی کے ماہرین کی ہے دراوڑی زبانیں ہند آریائی سے بالکل مختلف ہیں۔ اصل میں مسئلہ یہ نہیں کہ اردو کہاں سے نکلی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا مرکز و محور کہاں رہا ہے۔ اس میں سب سے اہم نظریہ وہ تھا جو حافظ محمود شیرانی کا تھا کہ یہ پنجابی سے نکلی ہے۔ شیرانی کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اس کو پنجابی سے نکالیں۔ انہوں نے تو "دکن میں اردو" نصیر الدین ہاشمی کی کتاب کے نمونے پر پنجاب میں اردو کے نمونے جمع کرنے شروع کئے۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ دکنی اردو اور پنجابی اردو کے نمونوں میں قواعد میں حیرت انگیز مماثلت ہے لہٰذا انہوں نے ان نمونوں کا ایک دیباچہ لکھا جس میں اس نقطۂ نظر کی ترویج کی۔ انہوں نے بتایا کہ اس پورے علاقے میں برج بھاشا رائج تھی جس سے پنجابی نے ہریانی اور کھڑی میں تبدیل کیا جو کہ میرے خیال سے نہ تاریخی نقطہ نظر سے صحیح ہے اور نہ لسانی نقطہ نظر سے۔ اس لئے کہ تاریخ میں ہمیں کہیں لاہور سے دلی ہجرت بھی اتنی بڑی مثال نہیں ملتی کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ لاہوریوں

کے قافلے نے دہلی اور نواح کی پوری زبانوں کو متاثر کیا ہو۔

ڈاکٹر سلیم اختر: تحقیق ہمارے اور آپ کے یہاں صرف حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ایک تو وہ محقق ہیں جو چیزوں کو ثابت کرتے ہیں۔ ایک وہ جو بظاہر مسلمہ نظریات پر ضرب لگاتے ہیں جس کی نمایاں مثال رشید حسن خان ہیں۔ دونوں طرح کی تحقیق میں زیادہ مثبت تحقیق کونسی ہے؟"

خلیق انجم:۔ آپ نے جس تحقیق کے بارے میں خاص طور پر رشید حسن خان صاحب کا نام لیا۔ اس کا آغاز اصل میں اس شخص نے کیا تھا جس کو ہم اردو تحقیق کا سب سے پہلا محقق لکھتے ہیں یعنی حافظ محمود شیرانی۔ ایک مولوی شفیع صاحب تھے۔ ان کا اثر ان حضرات پر پڑا جن میں امتیاز علی عرشی وغیرہ شامل تھے۔ منفی تحقیق کا پہلا اثر اس وقت پڑا جب قاضی عبدالودود نے یونیورسٹی کے لوگوں کو اپنا شکار کیا۔ جن میں اختر اورینوی اور خواجہ احمد فاروقی شامل تھے۔ سراج منیر نے کہا تھا کہ کتابوں کے تبادلے نہیں ہوتے۔ ان کا کیا اثر پڑتا ہے تو میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ شاید ہمارے ادب نے آپ کو بہت متاثر نہیں کیا ہے اور نہ ہی آپ کے ادب نے ہم کو۔ کیونکہ دونوں ممالک کا ادب انفرادی معاشرتی زندگی یا سیاسی نظام پر منحصر ہے لیکن اس کا اثر تحقیق پر بہت پڑا وجہ اس کی یہ ہوئی کہ تحقیق میں ایک ہی موضوع پر آپ کے یہاں بھی کام ہوا اور ہمارے یہاں بھی ڈپلیکشن ہوا۔

زاہد مسعود:۔ جہاں یہ فرق واضح ہوتا ہے وہ ادبی تاریخ کا میدان ہے۔ اردو کی ادبی تاریخیں پاکستان میں بھی لکھی گئیں اور انڈیا میں بھی۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گے۔

خلیق انجم:۔ آپ کے یہاں تاریخ ادب اردو جمیل جالبی صاحب نے لکھی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر تاریخ ادب بھی ہے۔ ہمارے یہاں اس طرح کا کام شروع ہوا تھا۔ لیکن جب اس کی پہلی جلد چھپی تھی تو وہ رشید حسن خان کی شکار ہوگئی۔ اب ترقی اردو بورڈ نے ایک سکیم شروع کی ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے کہ چار جلدوں میں ہے یا پانچ جلدوں میں ہے لیکن تاریخ لکھنے کا کام صرف ایک آدمی کا ہے۔

انتظار حسین :۔ مجھے انڈیا اور پاکستان کے اردو ادب میں ایک فرق محسوس ہو رہا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو جس قسم کی بغاوتیں ہماری شاعری میں ہوئی ہیں وہاں ان بغاوتوں کا کچھ احساس نہیں ہوتا لیکن جب ہم شاعری سے تنقید کی طرف جاتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تنقید بہت بدلی ہے ایک نیا طرز احساس اور تجزیے کا ایک نیا انداز نظر آتا ہے۔

حامدی کاشمیری :۔ شاعری میں ایک فرق یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد تخلیقی فن کاروں کے سامنے اپنے تشخص کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ انڈیا کی شاعری میں یہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ کیوں کہ وہ ایک مسلسل دھارا تھا جو چل رہا تھا اور چلتا رہا۔ یہی واضح فرق ہے جو شاعری میں نظر آرہا ہے۔

انتظار حسین :۔ صرف یہی مسئلہ نہیں ہے۔ پاکستانی غزل کو لے لیں جتنی توڑ پھوڑ اس میں ہوئی ہے وہ وہاں کی غزل میں نظر نہیں آتی۔

جگن ناتھ آزاد :۔ فارم میں جہاں تک بغاوت کا تعلق ہے تو آزاد غزل انڈیا میں پیدا ہوئی آپ بتائیے کہ کیا آپ توڑ پھوڑ کی بات فارم پر کر رہے ہیں یا کنٹنٹس کے بارے میں۔

انتظار حسین :۔ دونوں اعتبار سے۔

سلیم اختر :۔ فارم کا جہاں تک تعلق ہے اس میں ایک آزاد غزل میں کیا توڑ پھوڑ

ہو سکتی ہے۔ جہاں تک طرزِ احساس کی تبدیلی کا سوال ہے تو ۴۷ء کے بعد ناصر کاظمی سے غزل بالکل بدل جاتی ہے۔

گوپی چند نارنگ:۔ وقت کی تبدیلی کے نتیجے میں نئی تحریکیں اور نئے رجحانات پیدا ہوتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی رجحان یا تحریک کہیں پیدا ہوتی ہے اس سے استفادہ عام ہوتا ہے۔ دوہا پہلے آپ کے یہاں لکھا گیا لیکن یہ خالص انڈیا اور ہندی کی چیز ہے۔ اس وقت انڈیا اور پاکستان کے لیئے اذہان برابر ٹکرا رہے ہیں اور ایک نئے فارم میں اپنی شناخت کروا رہے ہیں۔

حامدی کاشمیری:۔ انتظار حسین صاحب! آپ کا جو یہ تاثر ہے کہ پاکستان میں شاعری بہ حیثیت مجموعی زیادہ زرخیز اور باغیانہ ہے۔ ایک حد تک درست ہے۔ ہندوستان میں بہت سے نئے شعراء کے یہاں نثریت، وضاحت اور پرانے الفاظ کا اعادہ ملتا ہے لیکن غزل کے کئی اشعار میں نئے الفاظ لئے گئے ہیں۔ انڈین غزل میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تجربے کو علامت کے پیرایے میں پیش کیا جاتا ہے۔ تنقید کے معاملے میں مجھے آپ سے اتفاق ہے انڈیا میں تنقید میں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ تجزیاتی بنایا جائے۔ ہم فنکار یا اس کے عہد یا اس کی نفسیات کے بجائے فن پارے پر توجہ دینے لگے ہیں میری کوشش رہی ہے کہ شاعر کے بجائے شاعری پر توجہ کروں اور لسانی بنیادوں پر فن پارے کا تجزیہ کروں۔ انڈیا میں محمود ہاشمی، شمس الرحمان فاروقی اور نارنگ اور دوسرے حضرات تنقید میں اسی نئی جہت کا اضافہ کر رہے ہیں۔

منیر احمد شیخ:۔ جب انڈیا سے ادیبوں اور دانشوروں کا کوئی وفد پاکستان آتا ہے تو بعض قارئین کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کا تی ترقی کے باوجود ایک تہذیبی عمل کا حصہ بن سکے۔ جیسا کہ

ہمارے یہاں یہ اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے مزید وہاں اردو کے لیے جو کام ہو رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

کنور مہندر سنگھ بیدی :۔ میں پہلے بھی یہ کہہ چکا ہوں کہ میں سو فی صد مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن یہ کہنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کہ آج سے تیس سال پہلے جو مایوس کن حالات تھے۔ ہم ان سے نکل کر ایک صحیح راستے کی جانب چل پڑے ہیں۔ منزل ہماری نگاہ میں ہے اور ہماری حوصلہ افزائی ہو رہی ہے ہندوستان میں دیہات کی بولیاں ایسی ہیں کہ وہ علاقائی زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن عام طور پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ اردو ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہاں رسم خط اردو کا کیا ہے تو یہ بات بالکل غلط ہے کہ اس کو بدل دیا گیا ہے اگر رسم خط کو ہی تبدیل کیا جائے تو اس زبان میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔

عطاالحق قاسمی :۔ غالباً عصمت چغتائی نے اس کی حمایت کی تھی کہ اس کو تبدیل کیا جائے۔

گوپی چند نارنگ :۔ عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند اردو رسم خط کے بجائے، دیوناگری رسم خط اپنانے کی حمایت کر رہے ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی :۔ جنہوں نے دیوناگری کی بات کی ہے یہ ان کی انفرادی بات ہو سکتی ہے۔ مجموعی طور پر ہم اپنے رسم خط سے مطمئن ہیں۔

عطاالحق قاسمی :۔ میں فہمیدہ صاحبہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اردو کی ترقی کے لیے کروڑوں فنڈز ہیں۔ ادیب کتابیں بھی چھاپتے ہیں لیکن یہ بتایئے کہ اس کے ریڈرز پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جا رہا ہے؟

فہمیدہ بیگم :۔ ہمارے یہاں چار اکیڈمیز ہیں۔ حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔ پانچ ہزار سے پانچ لاکھ تک ان اکیڈمیوں کا خرچہ ہوتا ہے۔

تعلیم بالغان کے مراکز بھی چل رہے ہیں، مدرسوں میں اردو کے طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔
مناظرہ اختتام پذیر ہوا۔ مناظرے کے دوران متعدد تصویریں لی گئیں، دونوں ممالک کے ادیبوں
کے درمیان آزادانہ اظہار خیال کی یہ نشست بہت اچھی رہی، کئی مسائل کے بارے میں اختلاف خیال
بھی رہا۔ خود بھارتی وفد کے ادیبوں نے بعض مواقع پر ایک دوسرے سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کیا، یہ
ایک صحت مند بات ہے — رات کافی ہو چکی تھی، ہم چائے پیتے رہے، لیکن تھکاوٹ کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔

## جمعرات ۱۶ جنوری

صبح نو بجے ہم گورنر صاحب سے ملنے گئے۔ گورنر ہاؤس ایک وسیع سرسبز
احاطے میں سفید رنگ کی بلڈنگ ہے، ہم ایک وسیع و عریض ہال میں بٹھائے گئے۔
گورنر صاحب سے کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں گورنر صاحب بیدی صاحب
کے واقف کار اور قدر داں ہیں۔ وہ ان سے ذاتی نوعیت کی گفتگو کرتے رہے۔
تنومند اور وجیہ ویٹر چائے سرو کرتے رہے۔ گورنر صاحب کی فرمائش پہ
بیدی صاحب نے اپنے اشعار سنائے۔ ان کے علاوہ مسعود صاحب، آزاد صاحب
اور میں نے غزلیں سنائیں، گورنر صاحب کی وضع داری اور شائستگی ان کی وضع قطع، لباس اور طرز کلام سے مترشح تھی،
ہم ہلٹن واپس آگئے، دھوپ بہت خوشگوار تھی۔
ہلٹن کے مقابل لاہور کا مشہور چڑیا گھر ہے۔ سڑک پر کاروں کی ریل پیل
ہے۔ دائیں بائیں، خوبصورت اور بلند و بالا عمارتیں۔ سرسبز پیڈا الحمرا آرٹ سنٹر میں
ایک روزہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا اور بھارتی کتابوں کی نمائش ہو رہی تھی ہم سب
الحمرا پہنچ گئے۔ اسی سرکاری اعزاز کے ساتھ۔
الحمرا آڈیٹوریم بہت کشادہ اور خوبصورت ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب
میاں نواز شریف صاحب تشریف لائے۔ قمیض، شلوار اور واسکٹ میں ملبوس
چہرے سے سنجیدگی اور نجابت مترشح ہے۔

الورسعیدیہ آئے۔ میں نے دور ہی سے اُن کو پہچان لیا۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ ہم گلے ملے۔ میں نے وزیر آغا کے بارے میں پوچھا۔ میں ان سے ملنے کے لئے حد درجہ بے چین تھا۔ لیکن یہ سن کر افسوس ہوا کہ وزیر آغا آنے سے معذور تھے۔ ان کی بیٹی کی صحت ناساز تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے سلیم آغا قزلباش ملے۔ ان سے ملکر خوشی ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آغا صاحب چاہنے کے باوجود نہ آسکے۔

لطیف کاشمیری خلوص و شفقت کا پیکر بنے کھڑے تھے انہوں نے کہا کہ انہوں نے آئینہ ادب کے مالک شیخ عبدالسلام صاحب کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کے بارے میں بات کرلی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد عبدالسلام صاحب تشریف لائے بزرگ، شفیق، وضعدار، خلیق الطبع انہوں نے کشمیر سے اپنے دیرینہ تعلق خاطر کا ذکر کیا۔ ان کے رفیق کار نے ان ایام کا ذکر کیا۔ جب وہ کشمیر آتے تھے اور پہلگام اور گلمرگ کی سیر کرتے تھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے وہ خط دکھایا جو آج ہی ان کو ملا تھا۔ جو میں نے سرینگر سے پاکستان روانگی کے وقت ان کے نام لکھا تھا۔

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

"لیجئے مکتوب سے پہلے مکتوب نویس ہی آگیا"۔ میں نے کہا

سراج منیر سے بات چیت کا موقع ملا۔ خوش گفتار اور خوش وضع، عالم باریک بین نقاد، حسن رضوی، "ناصر کاظمی کی شاعری" کا تقاضا کرتے رہے۔ میں نے کتاب دینے کا وعدہ کرلیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ہال میں جاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر حامدی، دیکھا آپ نے، پاکستان میں آپ کے کتنے چاہنے والے ہیں اور ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ آپ نے پاکستانی ادب کو جس گہری نظر سے دیکھا ہے اور

تفصیل سے دیکھا ہے اس کا انہیں احساس ہے"۔

آپ مجھے بار بار شرمندہ کر رہے ہیں، میں نے لجاجت سے کہا،

ڈاکٹر صاحب مریم سے مخاطب ہوئے،

"میں جانتا ہوں کہ آپ حامدی کاشمیری کی کیوں اتنی حفاظت کر رہی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں انکی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔" "آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں ان پر برابر نظر رکھے ہوئے ہوں"۔؟

قہقہہ!

محمد طفیل مدیر نقوش سے ملاقات ہوئی۔ خاموش، سنجیدہ کم گو بزرگ، فربہ اندام نقوش کے میر نمبروں کا ذکر چلا، انہوں نے ڈاکٹر اکبر حیدری کی خیریت پوچھی، اردو رسائل میں ماہنامہ شاعر کا ذکر رہا۔ میں نے کہا کہ شاعر ہی ہندوستان کا واحد معیاری رسالہ ہے انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا، مریم نے ڈاکٹر میمونہ انصاری، سے تعارف کرایا۔ انہوں نے مرزا رسوا پر کتاب لکھی ہے، افسانہ نگار خاتون سائرہ ہاشمی سے مل کر دلی خوشی ہوئی، مرزا ادیب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو دیکھنے کا دلی اشتیاق تھا۔

تقریب کا آغاز ہوا

سراج منیر نظامت کے فرائض ادا کرنے لگے۔

ڈائس پر ڈاکٹر وحید قریشی، وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف، سفیر ہند الیس کے سنگھ غلام ربانی اگرو اور بیدی صاحب تشریف فرما تھے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد سراج منیر نے میزبان خصوصی اگرو صاحب کو دعوت دی کہ وہ خطبۂ استقبالیہ پیش کریں۔ انہوں نے پاکستان خاص کر لاہور کی ادبی روایات کا ذکر کیا اور بھارتی وفد کی آمد کو پاک وہند کی ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل قرار دیا۔
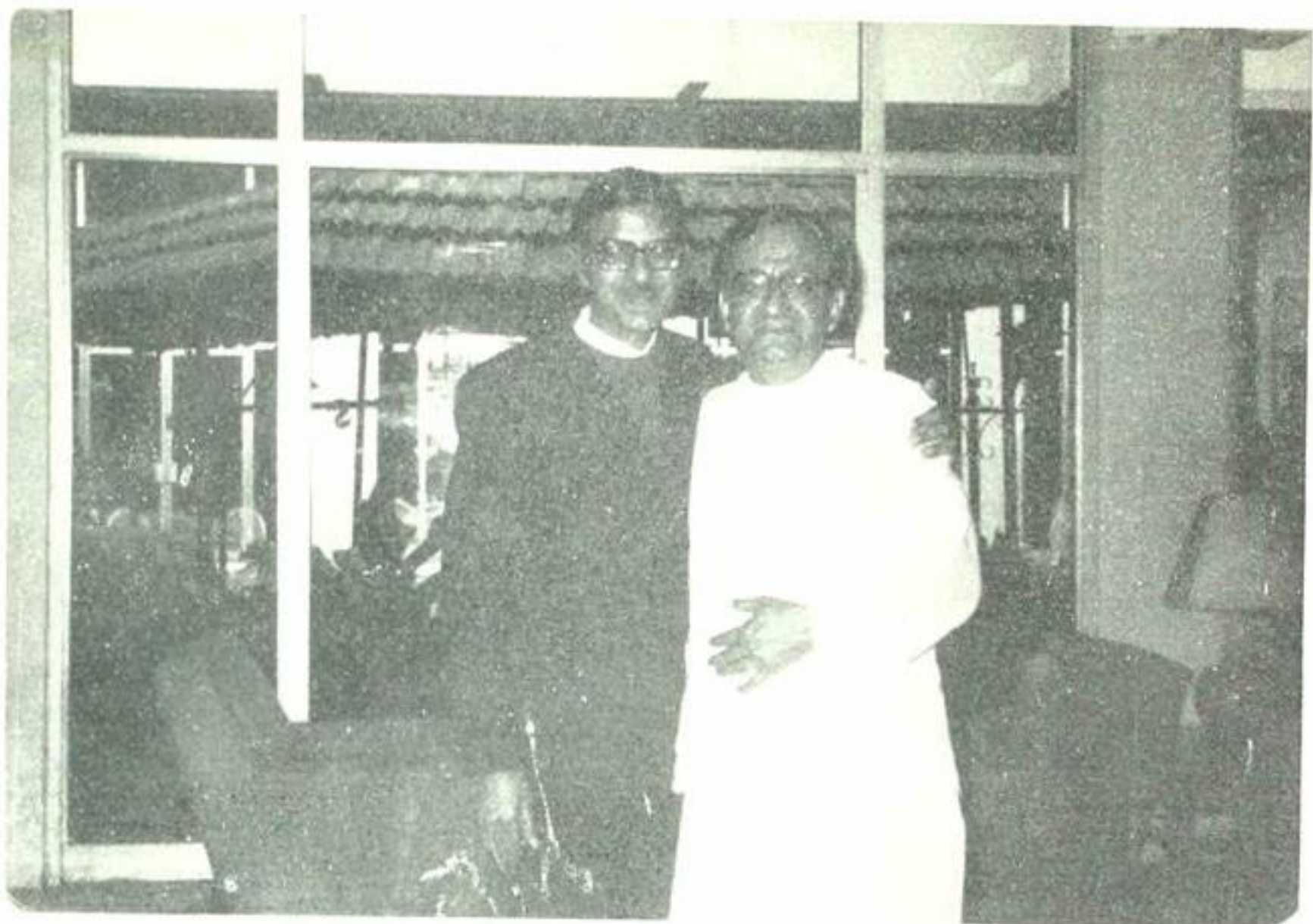
غلام ربانی اگرو،    حامدی کاشمیری

ڈاکٹر حامدی کاشمیری، انتظار حسین، مصرہ مریم، کشور ناہید۔

امجد اسلام امجد، ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ریاض احمد، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، مصرہ مریم

شری سنگھ نے اپنی تقریر میں اردو کی قدیم لسانی اور ادبی تاریخ پر روشنی ڈالی اور اس بات کی تردید کی کہ بھارت میں اردو کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے انہوں نے کہا کہ اردو ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان ایک اہم رابطے کا کام انجام دے رہی ہے۔

وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف صاحب نے پاکستان اور بھارت کے درمیان وفود کے تبادلوں کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ وفود کے تبادلوں سے نہ صرف دونوں ممالک قریب آئیں گے بلکہ دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے ہاں تخلیق و تحقیق کے بارے میں جانکاری ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں موجودہ حکومت نے تعلیمی اور سرکاری سطح پر اردو زبان کے فروغ کے لئے متعدد مراکز کھولے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا لاہور اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی صحافت اور ادب پورے ملک کیلئے مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ کئی ادیبوں اور شاعروں نے لاہور ہی سے ادبی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ آج علامہ اقبالؔ، محمد حسین آزادؔ اور فیضؔ اسی شہر میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ انہوں نے لاہور کے مشاہیر یعنی ظفر علی خان، پطرس بخاری، صوفی تبسم، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اختر شیرانی، جگن ناتھ آزاد اور راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں کہا کہ انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین اور دوسرے اہل قلم یہاں کے ادبی افق پر چمکے۔ آج ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی تحقیق سے اردو کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

بیدی صاحب نے کہا بھارت میں آج اردو کی ترقی کے لئے وسیع پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ میرے دعوے کی تصدیق ان پانچ ہزار کتب سے ہو سکتی ہے۔

جو ہم اپنے ساتھ لائے ہیں۔"
آخر میں صدر مجلس ڈاکٹر وحید قریشی نے وفد کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اور کہا پاکستان اور بھارت کے درمیان یگانگت اور ہم سائیگی کے تعلقات کو استوار کرنے میں اردو زبان اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

سراج منیر نے تقریب کے خاتمے کا اعلان کرنے سے پیشتر وفد کے آنے پر مسرت کا اظہار کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ آج کے سیمنار کے انعقاد سے دونوں ملکوں کے درمیان مظبوط تعلقات کے فروغ کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

کتابوں کی سہ روزہ نمائش کا افتتاح ہوا۔ یہ رسم وزیر اعلیٰ نے انجام دی۔ لوگ اشتیاق سے کتابوں کی نمائش دیکھتے رہے۔ اس کے بعد شامیانے میں چائے کا دور چلا۔

وقفے کے بعد آڈی ٹوریم میں سیمنار کی کاروائی شروع ہوئی سب سے پہلے فہمیدہ بیگم نے بھارت میں اردو کے موضوع مضمون پڑھا دہ نصف مقالہ پڑھ چکی تھی کہ بجلی چل گئی ناچار ہال کے باہر برآمدے پر سیمنار کی لقیہ کاروائی جاری رکھی گئی۔ میں نے شیخ عبدالسلام کو اپنی کتابیں پیش کیں انہوں نے وعدہ کیا کہ یہ کتابیں بتدریج چھپ جائیں گی۔ کئی ادیب اور شاعر جلسے سے اٹھ کر لان میں کھڑے ہوئے۔ میں حسن رضوی۔ انور سدید اور عطاالله قاسمی سے باتیں کرتا رہا۔ کتابوں کی سہ روزہ نمائش موضوع گفتگو رہی یہ نمائش نیشنل بک کونسل کے زیر اہتمام ہو رہی تھی۔ کونسل کے ڈایریکٹر اور ممتاز شاعر ذوالفقار احمد تابش بہ نفس نفیس موجود تھے۔
جگن ناتھ آزاد، خلیق انجم، مسعود حسین خان، اور رفیعہ سلطانہ نے مقالے پڑھے۔ میں نے بھی مقالہ پڑھا۔ خلیق انجم مقالہ پڑھتے رہے اور رفیعہ سلطانہ انہیں

بار بار ٹوکتی رہیں۔

"رفیعہ آپا، راستے بھر سمجھایا تھا کہ مضمون پڑھتے ہوئے مجھے ٹوکنا نہیں لیکن آپ برابر ٹوکے جا رہی ہیں۔"

"بھائی صاحب آپ نے غلط بات کہی کہیں پاکستانی بھائیوں کو غلط فہمی نہ ہو۔"

"اچھا ہوگا کہ آپ ہی یہاں آکر پڑھیے!"

کشور ناہید آگئیں۔ وہ مریم کو شاپنگ کے لیے ساتھ لے گئیں۔ کشور ناہید نے مریم کا تعارف مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ اور ٹیلی ویژن آرٹسٹ ثمینہ احمد سے کرایا۔ مریم نے ثمینہ احمد کو فوراً پہچان لیا وہ ٹیلی ویژن ڈراموں میں انہیں بار بار دیکھ چکی تھیں۔

ہم لوگ واپس ہلٹن گئے اور کھانا کھایا،

شام ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

ابوالفیض سحر، چتر ویدی اور میں نے انار کلی بازار کا ایک گشت لگایا۔ بھرا بھرا بازار، لوگوں کے ہجوم، عورتیں، بچے، مال سے معمور دکانیں، شور، ہنگامے، چہل پہل، لوگ فربہ اندام، سرخ و سپید رنگت، لباس اور وضع قطع آسودہ حالی کی مظہر — ہم نے عزیز و اقارب اور مسعود اور صبا کے لیے کچھ چیزیں خریدیں۔

ہوٹل کا کمرہ جگمگاتا رہا۔ ہم آرام کرتے رہے، اور اخبارات کو دیکھتے رہے۔

ابوالفیض سحر نے اطلاع دی کہ بیدی صاحب کے کمرے میں فلمی ہیرو محمد علی آئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ چتر ویدی نے کہا کہ نارنگ صاحب کمرے میں یاد کر رہے ہیں۔

میں وہاں گیا تو وہاں سلیم اختر، طاہر تونسوی، منیر احمد شیخ اور رشید امجد تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف۔ اتنے میں کشور ناہید آگئیں۔ تھکی تھکی سی۔

"اتنی تھکاوٹ"؟

"کیا کروں جی۔ آپ کی بیگم نے تھکا دیا ہے"۔

"حیرت ہے آپ شاپنگ بھی کروا سکتی ہیں۔ یہ ہرن پر گھاس لادنے کا عمل ہے"۔

"جائیے، اپنی بیگم صاحبہ کی خبر لیجیے، آیا وہ صحیح سالم ہی ہیں" انہوں نے جوابی کاروائی کی۔

میں نے اپنی کتابیں رشید امجد، کشور ناہید، سلیم اختر اور منیر احمد شیخ کو دیں۔

مریم نے کہا

"الحمرا سے نکل کر کشور ناہید نے مجھے اپنے دفتر لے گئیں۔ وہاں ہم نے ان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھایا۔ وہاں سے نکل کر ہم پہلے گلبرگ گئے۔ لاہور کا پاش علاقہ بڑی بڑی خوبصورت کوٹھیاں، کشادہ سڑکیں۔ پھر لبرٹی مارکیٹ گئے، وہاں شاپنگ کی، وہاں ہر چیز امپورٹیڈ ہے۔ راستے میں وہ مجھے اپنی درزن کے پاس لے گئیں۔ وہاں پر ایکٹریس صبیحہ خانم سے ملاقات ہوئی۔ پھر ہم انار کلی گئے۔ وہاں کچھ شاپنگ کی"۔

رات کو وزیر اعلیٰ نے ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اس سے پہلے ایم اے او کالج کی مجلس اقبال کے زیر اہتمام کالج میں پاک و ہند مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے نارنگ صاحب، کشور ناہید، رشید امجد، سلیم اختر اور منیر احمد شیخ سے معذرت کر لی اور مشاعرہ میں شرکت کے لیے گیا۔

"مشاعرہ لوٹ کے آ جائیے گا حامدی صاحب" نارنگ صاحب نے کہا۔

"میں جان بچا کر آؤں تو یہی بہت ہے"۔ میں نے کہا

مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی نے کی۔ نظامت عطاالحق قاسمی نے کی۔ پنڈال پر جگن ناتھ آزاد، ابوالفیض سحر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مسعود حسین خان، وحید قریشی اور میں بیٹھا تھا۔ مقامی شعرا میں امجد اسلام امجد، تحسین فراقی، سعادت سعید،

اجمل نیازی، اقبال ساجد، حفیظ تائب، انجم رومانی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے غزلوں کے چند اشعار سنائے۔ مقامی شعرا کے بعد ہم نے غزلیں سنائیں۔

چائے کے چند گھونٹ لینے کے بعد ہم نے پرنسپل صاحب مسعود الحق صدیقی اور دیگر اساتذہ سے معذرت کر لی۔

ہلٹن میں سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔

مستنصر حسین تارڑ، امجد اسلام امجد اور ریاض صاحب سے گفتگو ہوئی۔ کشور ناہید محبت خلوص اور اپنائیت کا مجسمہ، قہقہوں کے پھول بکھیرتی رہیں۔

"میں نے ناصر کاظمی کی شاعری "رات ہی کو لطف سے زیادہ پڑھ لی" منیر احمد شیخ نے کہا۔

"کل صبح آپ دونوں کو ہم اغوا کر رہے ہیں۔ کشور ناہید نے اعلان کیا۔

"چوری اور سینہ زوری" میں نے کہا۔

بوفے ڈنر تھا۔ کھانوں کی متعدد اقسام دعوت کام و دہن دے رہی تھیں۔

ڈاکٹر کنول دیر ملے۔ الحمرا میں دن کو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں لاہور آئے تھے۔

کمرے میں کتابوں اور چیزوں کا ڈھیر جمع تھا ایک اور اٹیچی کی ضرورت پڑی۔ ہم نے طے کیا کہ اگلے روز ایک اور اٹیچی خریدیں گے۔ سامان کو بے ترتیبی سے چھوڑ کر سونے کی تیاری کرنے لگے۔

## جمعہ ۱۷ جنوری

ناشتہ کمرے میں کونسٹر پر آیا۔ معلوم ہوا کہ جمعہ کی وجہ سے تمام مارکیٹ بند رہیں گے۔ اس لیے اٹیچی کا ملنا ناممکن تھا۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ اس لیے کہ سامان ابھی تک بکھرا پڑا تھا اور وقت کم تھا۔

ٹونبے کے مقامی پبلشروں نے ہلٹن میں وفد کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ ساڑھے
ٹونبے کشور ناہید، سلیم اختر اور طاہر تونسوی نے دھاوا بول دیا۔ ہم نے ہتھیار ڈالے
اور ان کے ساتھ ہو لیے۔ نارنگ صاحب اور جگن ناتھ آزاد بھی آئے۔ لیکن باہر آکر
آزاد پھر استقبالیہ میں گئے اور واپس نہ آئے۔

ہم سنگ میل پبلی کیشنز کے مالک چودھری نیاز احمد کے دولت کدے پر پہنچے۔
راستے میں بازار بند تھے۔

ڈرائنگ روم میں ادیبوں کا اجتماع تھا۔

انور سجاد سے ملاقات ہوئی۔ ادھیڑ عمر کی دلپذیر شخصیت، دیگر حضرات میں ڈاکٹر
آغا سہیل، مسعود اشعر، منیر احمد شیخ، شہرت بخاری، انتظار حسین، بیگم عالیہ انتظار،
الصبار عبدالعلی، یحییٰ احمد، مستنصر حسین تارڑ اور اصغر کریم سید موجود تھے۔

ہمیں نمکین چائے پیش کی گئی۔ بہت لذیذ بالکل ویسی جیسی کہ ہم گھروں میں بناتے
ہیں۔ وہی مزہ، وہی رنگ، وہی ذائقہ۔

"مریم اب کہو یہ نمکین چائے ہے کہ نہیں؟"

"آپ کا نمک چکھ چکے ہیں۔ کیسے انکار کریں۔"

ملحق کمرے میں ناشتے کی میز پر مختلف اقسام کی چیزیں سجی تھیں، سوجی کا
حلوہ، گاجر کا حلوہ، نہاری، دہی اور ہریسہ۔ ہریسہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں نے پلیٹ
پر بہت کم لیا، تاکہ دیکھوں اس کا ذائقہ کیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ہریسہ بالکل
ویسا ہی بنا تھا جیسا کہ سرینگر میں بنتا ہے۔ میں نے پوری پلیٹ لے لی اور خوب مزے
سے کھایا۔

"بالکل کشمیری ہریسہ ہے صرف اس پر باریک کاٹی ہوئی ہری مرچ اور دھنیا
کا اضافہ ہے۔" مریم نے کہا

"اس سے دو آتشہ ہو گیا ہے!" میں نے کہا لیکن مریم نے مجھ سے اختلاف کیا۔
ہم سبھوں نے خوب ہریسہ کھایا۔ کچھ لوگ ہریسہ اور دہی ایک ساتھ کھانے لگے۔ ہم لوگ تو ابلتا ہوا ہریسہ کھانے کے عادی ہیں۔

ناشتہ کرتے ہوئے خوب باتیں ہوئیں زوردار قہقہے بلند ہوئے۔ تصویریں لی گئیں۔ مریم نے اپنے کیمرے سے بھی تصویریں کھنچوائیں۔

مجھے پریشانی تھی کہ اٹیچی کا کیونکر انتظام ہوگا۔ ہم نے کشور ناہید اور نیاز احمد صاحب سے معذرت کر لی۔ انہوں نے باہر آکر ہمیں رخصت کیا۔

"دل کے کسی گوشے میں ہمیں یاد رکھیے" منیر احمد شیخ نے کہا،

"آپ تو کب سے دل میں آباد ہیں"۔ میں نے کہا۔

مسعود اشعر نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر اور طاہر تونسوی آ گئے۔ نارنگ صاحب نے کہا وہ وہیں سے مزار اقبال جائیں گے۔

مسعود اشعر نے کئی بازاروں کا چکر لگایا لیکن ہر بازار بند تھا۔ آخر میں سلیم اختر کے کہنے پر جمعہ بازار لے گئے۔ کار سڑک پر رکی۔ وہاں درجنوں کاریں رکی ہوئی تھیں اور کاروں کے اندر لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ ہم نے دکان سے سنسونائیٹ کی اٹیچی آٹھ سو روپے میں خریدی۔ میں اتنی قیمتی اٹیچی خریدنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن مریم کی اس دلیل کو کہ قیمتی چیز پائیدار ہوتی ہے۔ رد نہ کر سکا۔

"ایک سو ساٹھ کی اٹیچی جو کراچی میں خریدی اس کا حال دیکھو انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔" مریم نے کہا،

ڈاکٹر سلیم اختر نے ادب کی مختصر ترین تاریخ اور "اقبال اور ہمارے فکری رویے" اور طاہر صاحب نے "ہمسفر بگولوں کا" عنایت کی۔ سلیم اختر نے مجلد کتابیں دیں اور کہا میں نے سوچا ایک خوبصورت آدمی کو کتاب دینا ہے اس لیے کتابیں بھی خوبصورت ہوں

ہلٹن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وفد مزارِ اقبالؒ روانہ ہو چکا تھا اور وہاں کوئی کار نہ تھی ہمیں مایوسی ہوئی۔ سامان کو پیک کیا۔ سوچا ٹیکسی میں مزارِ اقبالؒ چلیں گے۔ لیکن ٹیکسی ملنا مشکل تھا۔ ریاض صاحب آ گئے۔ ہم نے ان کو بتایا کہ ہم مزارِ اقبال پر حاضری دینے کے لیے بے چین ہیں۔

"آیئے میرے ساتھ چلیئے۔ بس یوں گئے اور یوں آئے"۔

"نیک کام میں دیر کا ہے کی" میں نے کہا۔

راستے میں انہوں نے ہائی کورٹ بلڈنگ دکھائی جہاں ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ چلا تھا۔ ہم نے لاہور یونیورسٹی، ناصر پارک کی جلسہ گاہ، نیو ہوسٹل جہاں علامہ اقبالؒ رہتے تھے۔ سنٹرل ماڈل سکول، کربلا، حضرت داتا گنج بخش کا مزار اور گول باغ کو طائرانہ نظر سے دیکھا۔

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا!

ہم نے شاہی مسجد لاہور۔ ہیرا منڈی، مینارِ پاکستان اور وہ جلسہ گاہ دیکھی جہاں ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو اور قائدِ اعظم عظیم اجتماعات سے خطاب کر چکے ہیں۔ قلعۂ لاہور کے بعد مزارِ اقبال پر پہنچے۔ مزار کی زیارت کرتے ہوئے میں بہت جذباتی ہو گیا۔ آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ یہ سوچ کر میرا دل احساسِ فخر سے جھوم اٹھا کہ یہاں برصغیر کا وہ عظیم دانشورِ عالم، مفکر اور شاعر مدفون ہے جو کشمیر کا فرزند ہے اور کشمیری النسل ہونے پر ناز کرتا رہا، ریاض صاحب نے ہمارے کیمرے سے کئی تصویریں لیں۔ مزار لال رنگ کے حجرے میں واقع ہے۔ فرش پر سنگِ مرمر بچھا ہوا ہے اور مزار بھی سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے ریاض صاحب نے کہا کہ قبر کے دونوں طرف شیشوں میں مولانا رومی کے مزار کی مٹی رکھی ہوئی ہے۔

اراکین وفد پہلے ہی فاتحہ خوانی کر چکے تھے وہاں سے وہ جناح اسلامیہ کالج آف کامرس گئے تھے۔ جہاں پرنسپل ڈاکٹر محمد بشیر عنوریا نے استقبالیہ دیا۔ وفد نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کا بھی دورہ کیا وہاں کتابوں اور مینار پاکستان کے تحائف دیئے گئے۔

صادق نسیم نے اپنا مجموعۂ کلام "ریگ رواں" اور عطاء اللہ قاسمی نے معاصر دے دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ کہ ان کا بھیجا ہوا معاصر افتخار امام صدیقی مدیر شاعر لے چکے تھے۔

ہم لاہور ائیر پورٹ پہنچے،

سامان ہوٹل والوں کے سپرد کیا تھا۔ شام کو اسلام آباد میں صدر پاکستان کی دعوت تھی۔ ہمارے ساتھ لاہور کے ادیبوں میں محمد طفیل، ڈاکٹر وحید قریشی، طفیل ہوشیار پوری، امجد اسلام امجد اور دیگر حضرات شریک سفر تھے۔

سفر مزے سے کٹا۔ اسلام آباد ائیر پورٹ سے ہم سیدھے HOLIDAY INN پہنچے۔ وسیع، آراستہ، آرام دہ، جدید وضع کا ہوٹل ایک بڑا لاونج، کونٹر کے دونوں بازوں پر شاپنگ سنٹر ہیں وہاں بستر پر دراز ہوتے ہی نیند سے مغلوب ہوئے۔ کچھ دیر سونے کے بعد ہڑبڑا کر جاگے۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ سارا ہوٹل برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

صدر کے گیسٹ ہاؤس میں ہم ایک وسیع اور منور ہال میں آ گئے۔ پاکستان کی اہم اور چیدہ چیدہ شخصیتیں موجود تھیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ فوجی حکام وکلا، صحافی، پروفیسر اور دانشور جمع تھے۔ محسن احسان اور ان کی بیگم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ انہوں نے پشاور آنے کی دعوت دی۔ بیگم محسن نے مریم سے کہا۔ "ٹی وی پر آپ کی جھلک دیکھی تو دل نے کہا کہ آپ سے ملنا چاہیئے۔"

"آپ کی شفقت ہے" مریم نے کہا۔

بیگم محسن احسان بہت اپنا پن سے مریم سے گفتگو کرتی رہیں۔

میں مرزا حامد بیگ، سے نئے افسانے کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پریشان خٹک، ڈاکٹر خواجہ ذکریا۔ ارشاد احمد حقانی، ضیا جالندھری، احسن علی خان، شفیق الرحمان جمیل جالبی، وحید قریشی، جنرل رحیم الدین (جوئنٹ چیف آف اسٹاف) اختر جمال طفیل ہوشیار پوری اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری موجود تھے۔ سنگھ صاحب اور جین صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اتنے میں صدر پاکستان ضیا الحق صاحب تشریف لائے وہ مسکراتے ہوئے آئے اور فرداً فرداً اراکین وفد سے ملے۔ بیدی صاحب سے وہ بے حد محبت اور قربت سے ملے۔ ان سے کچھ وقت تک ذاتی امور کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بیدی صاحب کی بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کی پھر وہ پاکستان کے معززین سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے رہے۔

وہ اراکین وفد کی جانب پھر متوجہ ہوئے۔

نارنگ صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا،

"حامدی کاشمیری سری نگر سے آئے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں بے حد ذہین اور اہم نقاد" وہ مسکرائے اور مریم سے مخاطب ہوئے،

"آپ پہلی بار پاکستان آئی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کیوں، یہاں آپ کے رشتہ دار نہیں ہیں؟"

"جی نہیں، ہمارا یہاں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔"

"لیکن ہمارے خاندان تو بٹے ہوئے ہیں اب کوشش کر رہے ہیں کہ آنے اور جانے میں سہولت ہو۔"

ٹیلی ویژن والے متحرک تھے۔ فوٹو گرافر تصویریں لے رہے تھے۔

ڈنر کا وقت ہو گیا،

ہم اپنے مخصوص ٹیبل پر بیٹھے۔ ہمارا ٹیبل صدر کے بڑے ٹیبل کے دائیں جانب تھا۔ اس پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اعجاز بٹالوی، زیڈ کے سلہری، خلیق انجم، ڈاکٹر زمان ڈپٹی ڈائریکٹر اسلامک سٹڈیز، احسن علی خان، طفیل ہوشیارپوری، اگرد صاحب، مریم اور میں بیٹھے تھے۔ ٹیبلوں پر سفید رنگ کے میز پوش تھے۔ چمکتی پلیٹیں خوب صورت گلاس، ہر کرسی کے آگے ٹیبل پر مہمان کا نام ٹائپ میں رقم تھا۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہر شخص کو SEATING PLAN کی کاپی دی گئی تھی۔

اعجاز بٹالوی کی خوش گفتاری نے بہت متاثر کیا۔ وہ پاکستان کے مشہور وکیل اور دانشور ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم زماں ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورت حال کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ طفیل ہوشیارپوری مدیر محفل سے مل کر مسرت ہوئی۔ ان سے میرا دیرینہ تعارف تھا۔

"میں نے آپ کی کتنی کہانیاں محفل میں شایع کی ہیں" انہوں نے کہا

مشاعروں کی روایت کی بات چلی۔ طفیل ہوشیارپوری نے کہا "پاکستان میں اب یہ روایت ختم ہو رہی ہے لیکن ہندوستان میں ابھی زندہ ہے" میں نے کہا

سلہری صاحب قائد اعظم کے پہلے سوانح نگار ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد تلاوت کلام پاک ہوئی۔ پھر اگرد صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ انہوں نے وفد کی آمد پر جذبات تشکر کا اظہار کیا۔ طفیل ہوشیارپوری اور ضمیر جعفری، مسعود حسین خان، جگن ناتھ آزاد اور بیدی صاحب نے اپنا کلام سنایا۔

فرمان فتح پوری نے اپنے تاثرات کا پُرجوش اظہار کیا۔ انہوں نے کہا

پہلے بھی دونوں ممالک میں ادیب اور شاعر آتے جاتے رہے ہیں۔ لیکن یہ تاک جھانک کرنے کے برابر تھا۔ پٹنے پٹانے کے خطرات بھی لاحق تھے۔ لیکن آج حکومتوں کی اجازت سے ادیبوں کا وفد پوری آزادی سے گھوم رہا ہے۔

بھارتی وفد کے آنے پر یہاں کے لوگوں کو بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اس بار کتاب بھی آئی اور صاحب کتاب بھی۔ چنانچہ ان کو دیکھنے کے لیے سکھر نواب شاہ، حیدرآباد اور چترال تک کے ادیب آئے

بشریٰ رحمان نے کہا

"آج کی شب مجھے محبتوں اور شفقتوں کے اظہار کی دعوت دی گئی آپ جانتے ہیں کہ محبتوں اور شفقتوں کا اظہار جس طرح عورت کرتی ہے۔ مرد نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس میں ماں بہن اور بیٹی کی محبتیں شامل رہتی ہیں۔ قلم اور صرف قلم کا رشتہ اصل ہے اور مضبوط ہے ادب انسانوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے میرے ناول ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی نے میرے ناولوں سے متاثر ہو کر مجھے بیٹی بنا لیا اور عید پر مجھے عیدی بھیجی۔"

بیدی صاحب نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا "ہمیں پاکستان میں بے حد محبت ملی ہے۔ یہ شاعرانہ باتیں نہیں دل سے نکلی ہوئی بات ہے۔

آخر میں صدر پاکستان مائیک پر تشریف لائے "موسم سرما کی اس خنک شام میں پاک و ہند کے ادیبوں کی محفل گرم ہے۔ ہمیں ادیبوں کی میزبانی سے دلی مسرت ہو رہی ہے" ان کے لہجے سے مسرت چھلک رہی تھی۔

"میں ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کا ممنون ہوں وہ ہماری دعوت پر تشریف لائے ہیں۔ ادیب پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ خاص طور پر بیدی صاحب، آزاد صاحب، نارنگ صاحب اور مسعود حسین خان صاحب سے ہماری ملاقات رہی ہے۔ بیدی صاحب

ایک ادبی اور سماجی شخصیت ہیں اس سے پیشتر بھی انہوں نے اپنی محبتوں سے نوازا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں میں خیر سگالی اور محبت کا جو جذبہ ہے، جو خوشبو ہے وہ پھیل جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ہی جغرافیائی خطہ ہے دونوں تہذیبی، فکری اور ادبی سطحوں پر ایک ہیں۔ ہم ایک ہی جغرافیائی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں اور ۳۸ برس پہلے دو وحدتوں میں ڈھل گئے ہیں اور اب ان دو حقیقتوں سے انحراف ممکن نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم قلبی سطح پر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس سلسلے میں ادیب اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔"

انہوں نے امید ظاہر کی کہ دونوں ملکوں کے درمیان ایسے وفود کا تبادلہ ہوگا۔

انہوں نے کہا "بھارت کا وفد دورہ کر چکا ہے۔ اب ہماری باری ہے ہم بغیر دعوت ہی اپنے وفد کو بھیجنے پر تیار ہیں"۔

صدر پاکستان نے اکادمی ادبیات پاکستان سے کہا کہ وہ سیمناروں میں پڑھے گئے بھارتی ادیبوں کے مقالوں کو کتابی شکل میں شایع کرے۔

اپنی تقریر انہوں نے اس شعر پر ختم کی:۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

سوا گیارہ بجے شب یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ صدر موصوف نے باہر دروازے پر مہمانوں کو رخصت کیا۔

ہولی ڈے ان رات کے بارہ بجے پہنچے اگرو صاحب نے کمروں میں جانے سے روکا اور ڈرائنگ ٹیبل پر لے گئے اور چائے کافی اور جوس منگوایا۔

"پاکستان میں آپ کی یہ آخری رات ہے کچھ دیر کے لیے مل بیٹھیں"۔

"کمال ہے آپ ہم سے اب بھی سیر نہیں ہوئے" میں نے کہا۔

گپ شپ، باتیں، قہقہے!

رفیعہ آپا نے کہا۔

"صدر کی دعوت میں ہمارے ٹیبل پر مردوں نے شراب کے گلاسوں کے گلاس خالی کئے"۔

سب چونک پڑے،

"کیا کہہ رہی ہیں آپا" مریم نے ٹوکا،

"یہاں شراب ممنوع ہے صدر کی محفل میں شراب کیسے پیش کی جاتی؟"

"بی بی، وہ شراب تھی، میں نے گلاس کو چھوا تک نہیں"۔

"وہ کوکو کولا تھا آپا، میں نے بھی پی لیا" مریم نے کہا،

"کمال ہے آپ کوکو کولا کو شراب سمجھ بیٹھیں، اگرو صاحب نے کہا۔ سب نے قہقہہ لگایا۔

مجھے مسعود حسین خان کی بات یاد آئی۔

"رفیعہ صاحبہ معصومین میں سے ہیں"۔

"رفیعہ آپا آپ نے سیمنار میں خلیق انجم کو کیوں ٹوکا تھا"۔ نارنگ صاحب مزاحیہ موڈ میں تھے "ارے بھائی، یہ حضرت رو میں بہہ کر بکٹ کہانی کو نثر کہہ گئے اور محققوں میں حافظ محمود شیرانی کو بھول گئے اور کل کے بچے کا نام لیا۔ وہاں لاہور کے فرعون بیٹھے تھے"۔

لیجئے اگرو صاحب رفیعہ آپا آپ کو فرعون کہہ رہی ہیں"۔

قہقہہ!

فہمیدہ بیگم اٹھ کے گئیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ ابوالفیض سحر کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ نارنگ صاحب بھی اٹھے۔ واپس آکر انہوں نے یہ افسوسناک اطلاع دی کہ فہمیدہ بیگم

نے وہ مضامین بھی لکھوا دیئے ہیں۔ جو وہ دوبارہ ہم سے لکھوا چکی تھیں۔

"ہائیں کیا مصیبت ہے۔ پھر وہی شامت۔ ایک بار لکھوا دیا تو میں نے حافظے کی مدد سے لکھا۔ اب کیا کیا جائے۔ رفیعہ سلطانہ پریشان ہوگئیں۔

معاً خلیق انجم پریشانی کے عالم میں اٹھے وہ تھوڑی دیر کے بعد آئے اور کہا کہ ان کا پرس کہیں گر گیا ہے اس میں کچھ نقدی تھی اور کچھ ضروری کاغذات۔

ہم نے اظہار تاسف کیا'

" اتنی بڑی خوشی کے ساتھ تھوڑا سا غم تو ہوگا ہی میں نے کہا

ہم اپنے کمرے میں آئے۔ لیکن ابھی تک فہمیدہ بیگم کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میں نے خلیق انجم فرمان فتح پوری اور جمیل جالبی کے ساتھ تصویریں لیں۔ اتنے میں فہمیدہ بیگم اور ابوالفیض سحر آئے۔

"کیا مسودے مل گئے"؟

"جی ہاں! کار میں رہ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ڈرائیور سے رابطہ قائم کر کے مسودے مل گئے ہیں"۔ ابوالفیض سحر نے کہا۔

## سنیچروار ۱۸ جنوری

ساڑھے چھ بجے اٹھے۔ تیار ہوکر ناشتہ کیا۔ حاجی غلام الدین وانی صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔ میں نے کہا ہم یہاں سے فوراً سیدھے ائرپورٹ جا رہے ہیں۔ اس لئے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

"میں ائرپورٹ پر ہی ملنے کی کوشش کرونگا"۔

اعجاز راہی کا ٹیلیفون آیا۔ ان کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وہ صبح سات بجے آکر میرا انٹرویو لیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ غلطی سے شالیمار ہوٹل (راولپنڈی) پہنچ گئے اور وہیں

سے ٹیلی فون کر رہے تھے میں نے کہا کہ یہ معلوم نہ تھا کہ رات کو ہمارا قیام ہولی ڈے ان میں ہی ہوگا۔ خیر، یار زندہ صحبت باقی، پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی عابد صاحب نے یہ خوشخبری دی کہ خلیق انجم کا پرس مل گیا ہے وہ اسے ایوانِ صدر میں بھول گئے تھے۔

میں جلدی سے خلیق انجم کے پاس گیا۔ وہ ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہے تھے۔

"لیجئے خلیق صاحب، آپ کا پرس مل گیا ہے۔"

خلیق صاحب کا چہرہ کھِل اٹھا۔

"ارے صاحب۔ کہاں ہے؟"

"سب بتادوں گا لیکن پہلے دعوت ہو جائے"

"بھائی دہلی میں شاندار دعوت کھلاؤں گا۔

"پرس آپ کے پاس عابد صاحب لے کر آرہے ہیں۔"

میں واپس کمرے میں گیا۔

امجد اسلام امجد آگئے۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ "ساتواں در" دیا" اور مریم کو دہلیز (ٹیلی ویژن ڈراموں کی سیریز) پیش کی۔ ان کے ساتھ تصویریں لیں۔

رشید امجد نے پاکستانی ادب کی بقیہ جلدیں بھجوادیں۔

سب لوگ لاؤنج میں آگئے۔ بیدی صاحب مرکزِ توجہ تھے۔ وہ لطیفے اور چٹکلے سنا رہے تھے۔ مریم نے بیدی صاحب، نارنگ صاحب، جمیل جالبی اور فرمان فتح پوری کے ساتھ میری تصویریں لیں۔ خلیق انجم رات کو صدر پاکستان کے ساتھ دعوت میں لی گئی تصویریں لے کر آئے۔

نکہت سلیم نے مریم کو شاپنگ پر چلنے کی دعوت دی۔ ان کے ساتھ رفیعہ آپا بھی جا رہی تھیں۔ میں نے مریم کو جانے سے منع کیا۔ اس لئے کہ روانگی میں دیر ہو سکتی تھی۔ قافلہ روانہ ہوا چاہتا تھا۔
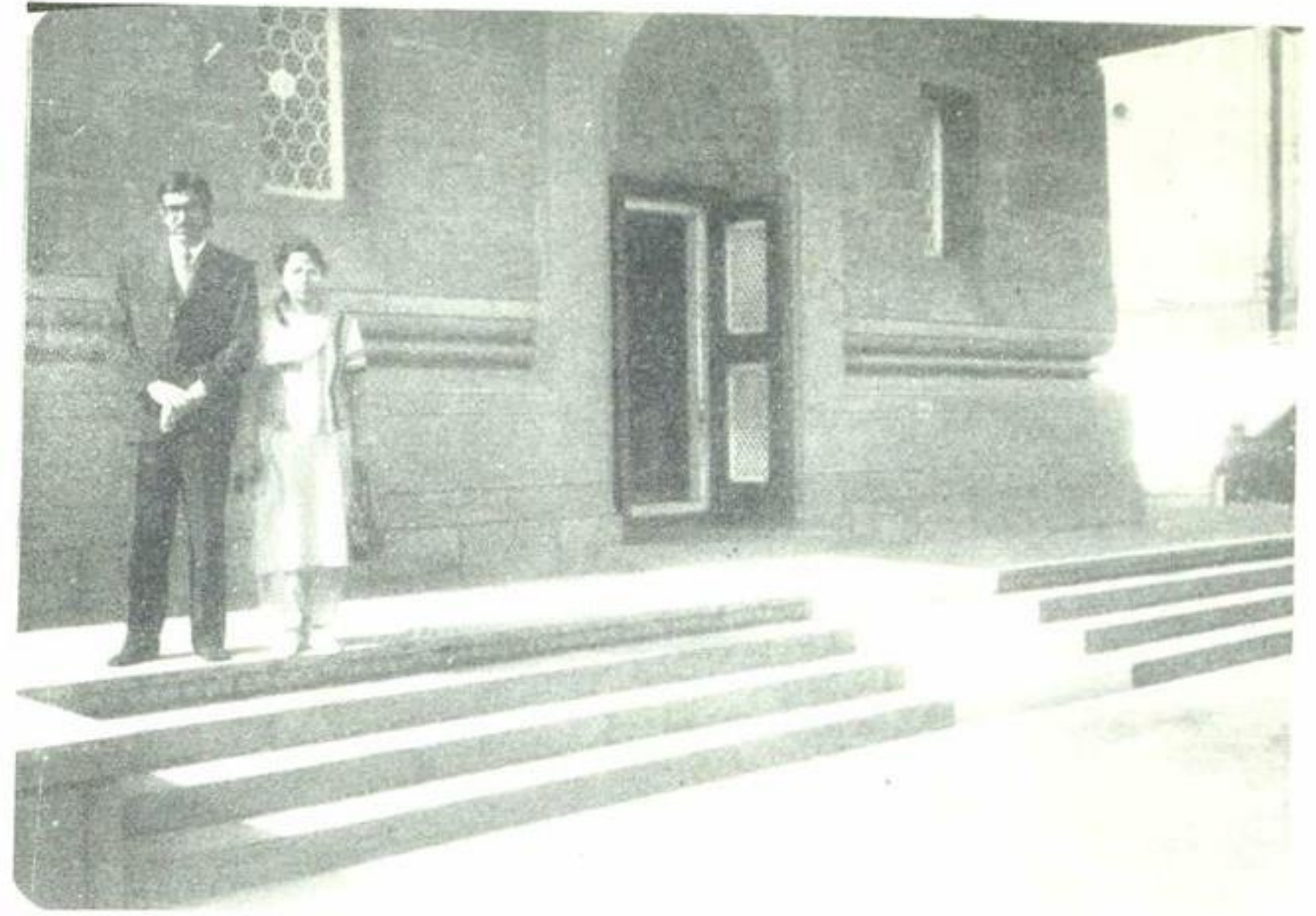
مصرہ مریم، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، مزار اقبال کے باہر

اراکین وفد شالیمار ہوٹل کے باہر
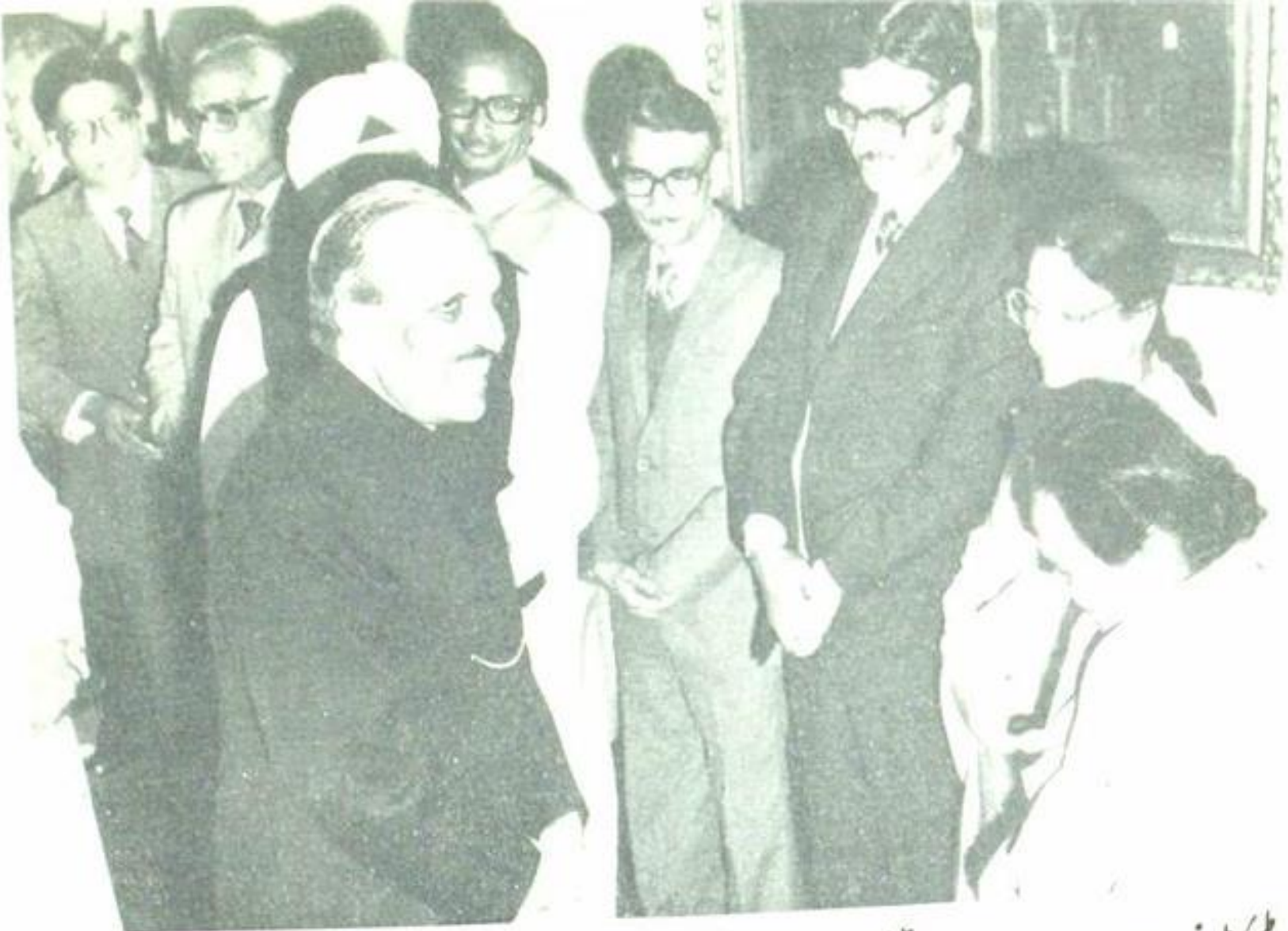
ڈاکٹر ربیعہ سلطانہ، مصرہ مریم، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، چترویدی، ابوالفیض سحر، کنور مہندر سنگھ بیدی، صدر پاکستان ضیاء الحق، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم۔

مصرہ مریم، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ابوالفیض سحر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، قائد وفد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، صدر ضیاء الحق، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مسعود حسین خان، صدر پاکستان ضیاء الحق (مرحوم) کے ساتھ اراکین وفد۔

ہم جمیل جالبی اور فرمان فتح پوری سے بغل گیر ہوئے۔ آنکھیں نم آلود اور دل میں جذبات کا ارتعاش!

ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔

راستے میں اپنے میزبان کرنل شفیق الرحمان سے ملے، مریم نے تصویریں لیں۔

"آپ نے تصویریں تو لیں۔ لیکن خود محروم ہو گئیں"۔ خلیق انجم نے کہا۔

"آپ بھی تصویر سے محروم ہی رہیں گے"۔ مریم نے کہا،

نارنگ صاحب نے اگرو صاحب سے کہا،

"ہم جس کار میں ہیں۔ میں، حامدی صاحب اور مریم بھابی وہ نکہت صاحبہ کی رہنمائی میں مارکیٹ سے ہوتے ہوئے جائے گی۔ آپ کی اجازت ہو تو۔"

انہوں نے حامی بھر لی،

مارکیٹ میں ڈرائی فروٹ کی کئی دکانیں نظر آئیں۔ ہم نے چلغوزے، نمکین پستے اور کشمش خریدی۔

ہم ایئرپورٹ پر کار سے اترے تو سامنے ایک باوقار ادھیڑ عمر کے معزز و محترم شخص کو اپنا منتظر پایا۔

"اچھا آپ غلام الدین وانی صاحب ہیں؟"

"جی ہاں" ہم انتہائی جذبۂ محبت سے بغل گیر ہوئے۔ وانی صاحب آبدیدہ ہو گئے اور میں بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ کہنے لگے "دونوں ملکوں کو دوستی کے راستے پر چلنا ہوگا اس کے سوا چارہ نہیں" وہ پرامید لہجے میں بولے۔

"حالات ایک اہم کروٹ لیں گے آپ یقین رکھیئے"۔ ہم پھر گلے ملے۔

میں نے مریم کا تعارف کرایا تو انتہائی خوشی کا اظہار کیا، کاش آپ گھر آتے۔ ہم دیدہ و دل فرش راہ کرتے۔ میں نے شرمندگی کا اظہار کیا۔

ان کی جذباتیت سے دل مسوس کر رہ گیا۔ کتنی المناک صورت حال ہے کہ لوگ بے وطنی کے شکار ہو گئے ہیں اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے سے محروم ہیں!

سنتی کشتان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

وانی صاحب سے رخصت ہو کر ہم لاؤنج میں پہنچے۔

نکہت سلیم نے چائے اور سینڈوچ پیش کیے۔ ٹیکسلا کے صفدر شاہ اور قلندر نما ادیب ہمیں رخصت کرنے آئے تھے۔ میں نے ان کی بے مثال دعوت کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کشمیر کو دیکھنے کی آرزو کا بار بار اظہار کیا۔ بشیر محمد صاحب کو ہمارے جانے کا افسوس تھا۔ اگرو صاحب اب قدرے خاموش ہو گئے تھے۔

لنچ کے لیے ائرلائنز کی عمارت کی تیسری منزل پر سب جمع ہو گئے۔ عطاء اللہ قاسمی، کشور ناہید، انتظار حسین، اور ان کی بیگم ہمیں رخصت کرنے کے لیے آ گئے تھے لنچ سے پہلے شاعری کا دور چلا۔ کشور ناہید نے مریم کو "فتنہ سامانی دل" اور "عورت" دے دی کتابوں اور اخبارات کے پیکٹ آتے رہے۔ میں کتابوں اور پیکٹوں کو دو دو ہاتھوں سے سنبھال رہا تھا۔ کشور ناہید ہماری حالت کا لطف لے رہی تھیں۔

رخصت کا لمحہ آ گیا!

ہر اچھی محبوب اور خوبصورت چیز اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور صرف یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ہم رخصت لے کر ویگن میں بیٹھے۔ نظریں ٹکرائیں۔ ہونٹ تھرائے اور ہاتھ ہلے۔

الوداع!!